باسمہٖ تعالیٰ

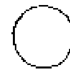
مطالب الفرقان

قرآن مجید کی تفسیر ـــ خود ـــ قرآن مجید سے

جلد ہفتم

سورۃ یوسف ـــ تا ـــ سورۃ الحجر

پرویز



طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/ بی گلبرگ ۲، لاہور

نام کتاب : ــــــــــ مطالبُ الفُرقان ۔ جلد ہفتم

مُصنّف : ــــــــــ غلام احمد پرویزؒ

پبلشر : ــــــــــ طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
۲۵ ۔ بی ، گلبرگ ۲ ، لاہور ، پاکستان ۔

طابع ــــــ دوست ایسوسی ایٹس
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور
فون : 712-2981

مطبع ــــــ عصمت اسلم پرنٹرز

ایڈیشن ــــــ اول فروری 1991
دوم جون 1995

صفحات ــــــ (ابتدائی 18) + 201 + (انڈکس 4)

طلوعِ اسلام ٹرسٹ

25-B گلبرگ II لاہور - 54660 پاکستان
فون : 879246 فیکس 876219

دوست ایسوسی ایٹس

الکریم مارکیٹ - اردو بازار لاہور 54000 پاکستان
فون : 712-2981

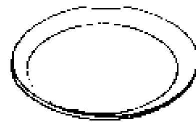
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آئینۂ مطالب

مطالب الفرقان ___ جلد ہفتم

باب دوم

سُورَۃُ الرّعد



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

مطالب الفرقان، محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا وہ سلسلۂ زریں ہے جو اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ابتدائے نگارش سے اُن کا یہ مسلک رہا ہے کہ حیاتِ انسانیہ کے ہمہ جہت مسائل کا حل قرآنی ہدایات کی روشنی ہی میں تلاش کرنا چاہیئے چنانچہ اُنہوں نے "قرآن مجید کی تفسیر۔ خود قرآن مجید سے" پیش کرنا شروع کی۔ اس سلسلہ کی پہلی پانچ جلدیں ان کی زندگی ہی میں پیشِ نظر قارئین ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی تھیں۔ جلد ششم طباعت کے لیے تیار تھی کہ وہ اپنے سفرِ حیات کی اگلی منزل کی طرف جادہ پیما ہو گئے چنانچہ یہ جلد ان کے بعد شائع ہوئی۔

محترم پرویز صاحب نے زیرِ نظر جلد ہفتم کا مسودہ اکتوبر ۱۹۸۴ء (بستر علالت پر فراش ہونے) سے پہلے ہی لکھ ڈالا تھا لیکن کتابت کے لیے اس کی تبییض کی سعادت اوّلاً امیر الدین بٹ اور بعد ازاں حسن عبّاس رضوی مرحوم کے حصّہ میں آئی۔ یہ جلد محمد سعید قطبی کی حسن کتابت کی رہینِ منّت ہے۔ سیّد شفقت حبیب نے بکمال دقّت کتابت کی تصحیح فرمائی۔ آئینۂ مطالب اور ابواب کی فہرستیں شیخ اللہ دتّا اور محمد عمر درازی کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہیں جبکہ انڈکس پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا مرتّب کردہ ہے۔

طلوعِ اسلام ٹرسٹ ان تمام احباب کا شکر گزار ہے جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب، تدوین، تحریر، کتابت اور طباعت وغیرہ کے سلسلہ میں دستِ تعاون دراز فرمایا۔

بعید از سپاس گزاری ہو گا اگر اس تمام عمل کے دوران محترم شیخ عبدالحمید مرحوم کی دیوانگیٔ شوق کا ذکر نہ کیا جائے جس نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مہمیز کا کام کیا۔

حرفِ آخر کے طور پر ہم یہاں محترم پرویز صاحب کا قرآن فہمی سے متعلق اپنا مسلک جو انہوں نے مفہوم القرآن پیش کرتے ہوئے بیان فرمایا تھا، بارِ دگر پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

> "آخر میں پھر اس حقیقت کو دُہرا دینا چاہتا ہوں کہ جو کچھ مفہوم القرآن میں پیش کیا گیا ہے وہ فہم قرآن کی انسانی کوشش ہے اور انسانی کوشش کبھی سہو و خطا سے منزہ نہیں ہو سکتی، نہ ہی اسے کبھی حرفِ آخر کہا جا سکتا ہے۔ میں نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں اپنی بصیرت کے مُطابق، ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ اگر میری یہ کوشش نتیجہ خیز ہوئی تو مجھ سے بہتر صلاحیتیں رکھنے والے اسے واضح سے واضح تر کرتے جائیں گے اور یُوں یہ سلسلہ قانونِ کائنات کے مُطابق، اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ قرآن فہمی کا سلسلہ نہ کسی دور میں ختم ہو سکتا ہے نہ کسی انسان تک پہنچ کر رُک سکتا ہے۔ یہ ایک جُوئے رواں ہے جو لامتناہی وسعتوں کا امکان رکھتی ہے۔ جُوں جُوں انسانی علم وسیع ہو گا، قرآنی حقائق بیش از بیش بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔"

زاھدہ خانم درّانی
انتظامی سربراہ
طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
۲۵۔ بی، گلبرگ ۲، لاہور، پاکستان

۱۳ فروری ۱۹۹۰ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بارہواں پارہ ——————— بارہویں سُورۃ



باب اوّل

سُورۂ یُوسُف

احسن القصص

○ جمالِ یُوسفی۔
○ ستاروں کا سجدہ۔
○ برادرانِ یُوسفؑ کی آتشِ حسد۔
○ یُوسفؑ درچاہ اور صبرِ یعقوبؑ
○ بازارِ مصر سے عزیز کے محلات میں۔
○ جذباتِ بے باک کی دست درازیاں اور بُرہانِ ربّ سامنے رکھنے والے کا کردار۔
○ غیر فطری تہذیب میں غیرت کا حشر۔
○ قیدخانہ اور وعظِ یوسفیؑ۔
○ بادشاہ کا خواب اور حضرت یوسفؑ کی تعبیر۔
○ رہائی سے قبل (عورتوں کے) معاملہ کی تحقیق کا مطالبہ۔
○ مسندِ بلند پر سرفرازی اور حسنِ انتظام۔
○ بھائی غلّہ لینے آئے۔
○ شاہی کٹورا کی گمشدگی اور بھائیوں کے ترکشِ حسد کا آخری تیر۔
○ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔
○ تاویل الاحادیث۔
○ خوابوں کی دُنیا۔
○ سجدہ۔
○ دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرت۔ رسولؐ کی سُنّت۔
○ داستانِ یوسفؑ — سامانِ عبرت و موعظت۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب اوّل

سُورَۃ یُوسُفَ

بارھویں سورۃ

جمالِ یُوسفی

(حُسنِ سیرت کی رعنائیاں)

مَطالبُ الفُرقان، جلد سوم (صفحہ ۵۲) میں بتایا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کس طرح اپنے وطن مالوف سے ہجرت کر کے کنعان اور شام کے علاقہ میں آئے۔ وہاں اُنھوں نے ایک مملکت قائم کی جو آلِ ابراہیمؑ تک قائم رہی (۴/۵۴)۔ اُن کے چھوٹے بیٹے حضرت اِسحاقؑ تو اس مملکت کے نگران رہے لیکن بڑے بیٹے حضرت اِسماعیلؑ کو حجاز میں بسایا گیا جہاں تولیّتِ کعبہ کی نہایت استقامت طلب خدمت اُن کے سپرد ہوئی حضرت اِسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ بھی کنعان میں رہے لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ اُن کے زمانے میں مملکت سمٹ کر قبیلہ کی سرداری تک محدود ہو گئی تھی۔ قرآن کریم میں حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا تفصیلی ذکر نہیں آیا، صرف اُن کا شمار زمرۂ انبیاءؑ میں کیا گیا ہے۔ (۲/۱۳۶ ؛ ۳/۸۴)۔ حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ تھے جن کی داستانِ جمیل و جلیل اِن صفحات کے لیے وجۂ زینت بن رہی ہے۔ میں نے اس داستان کو اپنی کتاب 'جُوئے نُور' میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ جو کچھ اب بیان کیا جانے گا وہ بیشتر اِسی سے مقتبس ہو گا۔

داستانِ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں دو خصوصیات نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ دیگر انبیاء کرامؑ کے احوال و کوائف قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں منتشر موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ تصریفِ آیات کے قرآنی اسلوب کے مطابق انہیں چُن چُن کر سلکِ گہر دار میں پرو دیا گیا ہے لیکن حضرت یوسفؑ کی داستان ایک ہی سورۃ میں مسلسل بیان ہوئی ہے۔

دوسرے یہ کہ دیگر اولوالعزم انبیاء کرامؑ کی داستانیں ان انقلابات کے تذکرے ہیں جو انہوں نے برپا کیے اس سلسلہ میں، ان انبیاء کرامؑ سے کہیں زیادہ اُن اقوام کے احوال و کوائف مذکور ہیں جنھوں نے ان کی دعوتِ حق و صداقت کی مخالفت کی اور بالآخر تباہ و برباد ہو گئیں۔ داستانِ حضرت یوسف اس قسم کے کسی تصادم یا انقلاب کا تذکرہ نہیں۔ یہ اس حقیقت کی مظہر ہے کہ ایک فرد کے جوہرِ ذاتی، اس کی سیرت کی بلندی اور کردار کی پاکیزگی، اُسے کس طرح خاک نشینی سے اُٹھا کر مدارج و مناصبِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن یہ راہ، صحنِ گلستان کی روش نہیں کہ جس میں انسان رنگینیٔ بہار کے جھُولے جھُولتا، مچلتا، لوٹتا، اٹھکیلیاں کرتا آگے بڑھتا چلا جائے۔ بلکہ یہ وہ کٹھن راستہ ہے جہاں قدم قدم پر ایسی صبر آزما اور نظر فریب لغزش کی گھاٹیاں آتی ہیں کہ وہاں سے ذرا پاؤں پھسلا اور انسان سیدھا ذلّت و خواری کے جہنّم میں جا گرا۔ اس راستہ سے ہر کانٹے سے دامن بچاتے اور ہر گھاٹی سے قدم سنبھالتے مردانہ وار صحیح و سلامت آگے بڑھ جانا یقیناً مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْر ہے۔ یہ ہے وہ راستہ جس میں ہر چشمِ بصیرت کو قدم قدم پر جمالِ یوسفی کی رعنائیاں جلوہ بار نظر آتی ہیں اور وہ قدم قدم پر اُن کے نقوشِ پا کے منبسم ذرّات کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھتی ہے کہ ؎

موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی!

لوحِ جبیں میں مستقبل کا آئینہ

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ فلسطین کی سرزمین میں، حضرت یعقوبؑ کے ہاں حضرت یوسفؑ کی پیدائش ہوئی۔ لوگ اس بچّے کو عام چہرہ والے سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے لیکن باپ (حضرت یعقوبؑ) کی حقیقت بین نگاہیں بیٹے کی پیشانی میں کچھ اور ہی جھلکتا دیکھ رہی تھیں۔ وہ اُس کی خُداداد ذہانت و فطانت اور سنجیدگی و متانت سے اس کی لوحِ جبیں پر کھُلے کھُلے الفاظ میں پڑھ رہے تھے کہ دایۂ فطرت اُسے کس طرح مویشیوں کی پاسبانی سے جہانداری و جہانبانی کے طَور طریق سکھا رہی ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر بیٹا باپ کی آنکھوں کا تارا بن رہا تھا لیکن یہ چیز دُوسرے بھائیوں[1] کی آنکھوں میں

[1] تورات بتاتی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے (مختلف بیویوں سے) بارہ بیٹے تھے جن میں حضرت یوسفؑ اور بنیامین حقیقی بھائی تھے۔

(باقی ص۳ پر)

کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی۔ یہیں سے اِس قصّے کی اِبتداء ہوتی ہے۔ لیکن اِس سے پہلے تمہیداً خود قرآن مجید کا خصوصی تعارف کرایا گیا ہے۔ فرمایا:

(12/2-1) الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿١﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢﴾ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿٣﴾

خُدائے علیم و رحیم کا اِرشاد ہے کہ یہ ایک واضح ضابطۂ قوانین کی کتاب ہے (۱) ہم نے قرآن کو واضح اور فصیح اِس لیے بنایا ہے کہ تم اچھی طرح سمجھ بوجھ سے کام لے سکو، تاکہ تم عقل سے کام لینا سیکھو۔ یعنی نزولِ قرآن کا مقصد انسانی عقل کو جِلا دینا ہے (۲) اے رسُولؐ! ہم اس قرآن کو، تم پر وحی کے ذریعہ نازل کر کے، تم سے انبیاء سابقہ اور اقوامِ گزشتہ کی سرگزشتیں بہترین طریق پر بیان کرتے ہیں۔ وہ سرگزشتیں جن سے تم نزُولِ قرآن سے پہلے باخبر نہیں تھے۔ (انہی میں یوسفؑ کی سرگزشت ہے جسے اب بیان کیا جاتا ہے)۔" (12/3-1)

آیات کا مفہوم تو واضح ہے لیکن آیت نمبر ۲ میں ایک ایسی عظیم حقیقت آگئی ہے جس سے یونہی آگے بڑھ جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کہا گیا ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا۔ قرآن کا اسلوبِ بیان نہایت واضح، صاف اور سُلجھا ہُوا ہے۔ اس میں کوئی پیچ وخم نہیں، کسی قسم کا ابہام نہیں۔ یہ رہی قرآن کے اسلوبِ بیان کی خصوصیت۔ اِس کے بعد ہے: لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "تاکہ تم سمجھ سکو، یا سمجھ جاؤ"۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کا اسلوبِ بیان ایسا نہیں کہ یہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس کے لیے قرآن کے طالب علم کو خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جس طرح (مثلاً) خارج میں روشنی ہو تو دیکھنے والے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی آنکھ کھُلی رکھے۔ اس کے بعد سب کچھ خود بخود نظر آنے لگ جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صـ۲) اور بنیامین سب سے چھوٹے تھے۔ حضرت یوسفؑ کی طرف باپ کا میلانِ خصوصی، سوتیلے بھائیوں کی آتشِ حسد و رقابت کا موجب بن گیا تھا۔ (کتاب پیدائش باب ۳۵: ۲۲-۲۶۔ باب ۳۷: ۳-۴)

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کا یہ مفہوم حقیقت اور منشاءِ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کریم خود بخود سمجھ میں نہیں آجاتا۔ اس کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس حقیقت کو قرآن نے ایک لفظ میں سموکر رکھ دیا۔ "تَعْقِلُوْنَ" فعل کا صیغہ ہے۔ اور فعل اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ فاعل وہ کام کرے۔ جہاں تک میری نگاہ یاوری کرتی ہے لفظ عقل کو فعل کے طور پر کسی زبان میں استعمال نہیں کیا گیا۔ کم ازکم اُردو میں تو قطعًا نہیں۔ اس لیے تَعْقِلُوْنَ کا ایک لفظ میں ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ نہ ہی اس قبیل کے دیگر الفاظ کا ترجمہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۔ (۲/۲۶۶) "اس طرح خدا نے اپنی آیات کو واضح طور پر بیان کر دیا تاکہ تم ان پر غور و فکر کرسکو"۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کا مفہوم کچھ اس قسم کے الفاظ میں ادا کیا جاسکتا ہے "تاکہ تم عقل سے کام لے سکو"۔ "تاکہ تم عقل کو بروئے کار لا سکو"۔ اس مفہوم کی وضاحت اس قسم کی آیات میں کر دی جہاں کہا۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۔ (۲/۱۷۱) "یہ لوگ بہرے، گونگے، اندھے بنے رہتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے "عقل" ایک صلاحیت ہے جو خود بخود کام نہیں کرنے لگ جاتی۔ اس سے کام لیا جائے تو وہ اپنا منصب ادا کرتی ہے، کام نہ لیا جائے تو بیکار رہ جاتی ہے۔ اس صلاحیت کو قرآن نے قلب کہہ کر پکارا ہے، جہاں کہا ہے: فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ (۲۲/۴۶) "تاکہ ان کی عقل سے کام لینے کی صلاحیت بیدار ہو"۔ گویا قلب وہ ذریعہ ہے جس سے انسان عقل کو بروئے کار لاتا ہے۔ مقصد اس بحث کا یہ ہے کہ عقلِ انسانی (آنکھ کی بینائی یا سماعت کی طرح) ایسی صلاحیت نہیں جو خود بخود بروئے کار آجائے۔ اسے بروئے کار لانا پڑتا ہے۔

اِس گفتگو سے واضح ہے کہ:

۱۔ کسی بات کے سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا اسلوبِ بیان واضح، صاف، نکھرا اور سُلجھا ہُوا ہو۔ قرآن کریم نے اِسی لیے بار بار کہا ہے کہ اس کا اندازِ بیان نہایت واضح اور مُبین ہے۔

۲۔ لیکن اِس کے اندازِ بیان کے واضح اور مُبین ہونے کے معنی یہ نہیں کہ اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے انسان کو خود کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ اسے اپنی عقلی صلاحیت کو استعمال کرنا پڑے گا۔ جو ایسا نہیں کرے گا، قرآن کے اسلوبِ بیان کی وضاحت اُسے کچھ فائدہ نہیں دے گی۔ یہ اُس قوم کے لیے منفعت بخش ہے جو عقل سے کام لے۔ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۳۰/۲۸)۔

اِسی سورۃ میں چار آیات آگے چل کر کہا گیا ہے: لَقَدْ كَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ (۱۲/۷)

یُوسفؑ اور اس کے بھائیوں کی اِس داستان میں اُن لوگوں کے لیے عبرت وموعظت کی نشانیاں ہیں جو حقیقت کے مُتلاشی اور صداقت کے جویا ہوں، جنھیں اس کی احتیاج ہو"۔ اس سے قرآن نے یہ بتایا کہ اس کے مَتن سے فیض یاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے دِل میں حقیقت تک پہنچنے کی طلب پیدا ہو، اِس سے عقل کی صلاحیت بیدار ہوگی اور قرآنی مفاہیم سمجھ میں آئیں گے۔ اِس سے آپ اُس قوم کی حالت کا اندازہ لگا لیجئے، جو ساری عمر ناظرہ قرآن پڑھنے میں صرف کر دے۔ ناظرہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ، ان کے معنی اور مطلب سمجھے بغیر، رٹتے چلے جائیں۔ جو ان الفاظ کو ایک ایک رات میں دُہرا کر (جسے شبینہ کہا جاتا ہے) ثواب دارین حاصل کرتے ہیں، جنھیں اس کے مترجم یا مفسّر ہونے کا دعویٰ ہو، (یا جو ان تراجم یا تفاسیر کی رُو سے اِسے سمجھنے کی کوشش کریں) وہ بھی اپنی عقل وفکر سے کام لینے کی بجائے صدیوں پہلے کے انسانوں کی عقل وفکر کو حرفِ آخر سمجھیں، جو نہ خود "سائلین" کے زُمرے میں آئیں نہ "عاقلین" کی صف میں، وہ قرآن سے کس طرح نفع یاب ہوسکیں گے؟ قرآن انہی کی سمجھ میں آسکے گا جو انسانی علم، تجربہ، مشاہدہ — جس سطح تک وہ پہنچ چکا ہے — اس کی روشنی میں، قرآنِ کریم کو، خود قرآنِ کریم کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اِس کے لیے دوسروں کے علم وادراک سے اِستفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن اِسے اتھارٹی نہیں سمجھا جاسکتا۔ قرآن کی اتھارٹی خود قرآن ہی ہے۔

اِس تمہید کے بعد داستانِ حضرت یوسفؑ کی طرف آئیے، جس کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔

۱۲/۴ إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ﴿۴﴾

جب یُوسفؑ نے اپنے باپ (یعقوبؑ) سے کہا کہ میں نے (خواب میں ۱۲/۴۳) دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں، اور چاند اور سُورج، یہ سب میرے سامنے جُھکے ہُوئے ہیں"۔

بیٹے کا خواب سُن کر باپ (حضرت یعقوبؑ) نے کہا:

۱۲/۵ قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۵﴾

باپ نے بیٹے سے کہا کہ اس خواب کو اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا (جو سوتیلے تھے ۱۲/۵۹) ورنہ وہ تیرے خلاف کسی منصوبے کی خفیہ تدبیریں کرنے لگ جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان (حسد وعداوت کا جذبہ) انسانوں میں تفرقہ پیدا کر کے، بھائی کو بھائی کا بیری بنا دیتا ہے۔"

یہاں دیکھئے، (حضرت) یوسفؑ کے بھائیوں کے حسد کو کس طرح "شیطان کی عداوت" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ شیطان اور ابلیس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۹۹ تا ۲۸۱) میں وضاحت سے بیان ہو چکا ہے کہ وہ خود انسان ہی کے بے راہرو جذبات کا نام ہے۔

باپ نے بیٹے (حضرت یوسفؑ) سے یہ تاکید کی؛ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اسے اُس کا مستقبل کس قدر درخشندہ نظر آرہا تھا۔ فرمایا:

۱۲/۶ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶

"میں جو تجھ میں مُضمر صلاحیتوں کے آثار دیکھتا ہوں تو اس سے مجھے نظر آتا ہے کہ تیرا پروردگار تجھے کس عظیم مقصد کے لیے منتخب کرے گا اور تجھے ایسی فراست وبصیرت عطا کر دے گا کہ تیری نگاہ معاملات کے انجام ومآل تک فوراً پہنچ جائے۔ وہ تجھے اپنی عنایات سے سرفراز کرے گا اور تیرے ذریعہ یعقوبؑ کے گھرانے پر اتمام نعمت کرے گا، جس طرح اُس نے، اس سے قبل تیرے آباء واجداد — ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ — پر اتمام نعمت کیا تھا۔ یقیناً تیرا پروردگار ہر بات سے واقف ہے اور اس کے فیصلے حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔"

"تاویل الاحادیث" سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت آگے چل کر کی جائے گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے گا کہ حضرت یوسفؑ پر اتمام نعمت کس طرح ہُوا۔

اس کے بعد بتایا کہ حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں پر کیا گزری۔ لیکن پہلے یہ واضح کر دیا کہ قرآن کریم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں جس میں ازمنہ گزشتہ کے احوال وکوائف محض واقعات کے طور پر درج ہیں۔ یہ انسانی زندگی

کے لیے ضابطۂ حیات ہے اور تاریخی شواہد اس ضابطہ کے کسی نہ کسی گوشہ کی تشریح و تائید کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) فرمایا:

۱۲/۷ لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ ﴿٧﴾

(آگے بڑھنے سے پہلے، اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قصّے سے، یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کی آویزش کی داستان بیان کرنا مقصود نہیں)، اس میں ہر اُس شخص کے لیے عبرت و موعظت کی واضح نشانیاں ہیں جو اپنے آپ کو ان نشانیوں کا ضرورت مند سمجھے۔ (سب سے پہلے تو خود رسول اللہؐ اور جماعتِ مومنین کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ جس مشن کو لے کر یہ اُٹھے ہیں، اس میں انھیں سب سے پہلے اپنے بھائی بندوں کی طرف سے طرح طرح کی تکالیف پہنچیں گی، لیکن انجامِ کار کامیابی انھیں ہی حاصل ہوگی)۔

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے، شدّتِ حسد و عداوت کی بنا پر، یہ اسکیم تیار کی کہ کسی نہ کسی طرح اِس کانٹے کو الگ کر دیا جائے۔

۱۲/۸-۹ إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨﴾ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ﴿٩﴾

" برادرانِ یُوسفؑ، آپس میں کہا کرتے تھے کہ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارا باپ، ہماری نسبت یُوسفؑ اور اُس کے (حقیقی) بھائی سے زیادہ محبّت کرتا ہے، حالانکہ ہمارا جتھّہ بڑا ہے اور اس اعتبار سے ہماری قوّت بھی زیادہ ہے۔ یقیناً اس باب میں ہمارا باپ بڑی غلطی کرتا ہے۔

چنانچہ انھوں نے باہمی مشورہ کیا کہ اس مصیبت کا حل یہ ہے کہ یوسفؑ کو قتل کر دیا جائے یا کسی دُور دراز جگہ پھینک دیا جائے تاکہ، اس کے بعد، باپ کی ساری توجّہ ہماری طرف مبذول ہے۔

اور ہمارے سارے کام سنور جائیں"

آیت کے آخر میں "صالحین" کا لفظ غور طلب ہے۔ ہمارے ہاں صالحین کا ترجمہ خُدا کے نیک بندے اور اعمالِ صالحہ سے مُراد نیک کام لیے جاتے ہیں۔ اس آیت کا مفہوم اگر یہ لیا جائے کہ اُنھوں نے کہا کہ یوسفؑ کو باپ سے الگ کر دیا جائے تاکہ اس کے بعد باپ کی ساری توجّہ ہماری طرف مبذول رہے اور اس طرح ہم نیک بندے بن جائیں" تو اس سے بات نہیں بنتی۔ اُنھوں نے کہا یہ تھا کہ اس وقت حالت یہ ہے کہ باپ کی ساری توجّہ یوسف پر مرکوز رہتی ہے جس سے ہمارے حالات اَبتر رہتے ہیں۔ یہ رکاوٹ دُور ہو جائے تو ہمارے حالات سنور جائیں گے۔ "صَلَحَ، اَصلَحَ، صالحہ" وغیرہ سے مُراد حالات کا سُدھرنا اور سنور جانا ہوتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ سے مراد ایسے کام اور ایسا نظام ہے جس میں انسانی ذات بھی سنور جائے اور معاشرہ میں بھی ہمواریاں پیدا ہو جائیں۔ فرد اور معاشرہ دونوں کی اِصلاح ہو جائے (اس کی تشریح مطالبُ الفرقان۔ جلد اوّل صـ۲۳۱ میں گزر چکی ہے۔)

توراتؔ[1] میں ہے کہ ان میں سے ایک بھائی (روبن) نے کہا کہ یُوسفؑ کو قتل نہ کرو، کسی اندھے کنوئیں میں پھینک دو۔ قرآنِ کریم میں ہے:

۱۲/۱۰ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۱۰

"ان میں سے ایک نے کہا کہ یُوسفؑ کو قتل نہ کرو۔ اگر تم نے اِس کے خلاف ضرور کچھ کرنا ہی ہے تو اِسے کسی (اندھے) کنوئیں کی گہرائی میں پھینک دو۔ کوئی راہ گیر قافلہ اِدھر سے گزرتا ہُوا اسے نکال کر لے جائے گا اور اس طرح تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا"

اِس سازش کے بعد وہ باپ کے پاس آئے۔

۱۲/۱۱-۱۲ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝۱۱ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۱۲

"(چنانچہ اس اسکیم کو سب نے پسند کیا اور) باپ کے پاس آکر کہنے لگے کہ ابّا جان! یہ کیا بات ہے کہ آپ یوسفؑ کے معاملہ میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے (اور اُسے ہمارے ساتھ کہیں آنے جانے نہیں دیتے

[1] کتاب پیدائش باب ۳۷: ۲۲

حالانکہ ہم اس کے دلی خیر خواہ ہیں۔

ہم کل باہر جا رہے ہیں، اسے بھی ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ یہ کھائے پیئے، کھیل تفریح کرے۔ ہم سب اس کی حفاظت کریں گے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ کی خصوصی تربیت کے لیے اسے اپنے قریب تر رکھتے تھے، لیکن دوسرے بیٹے اسے عدم اعتماد پر محمول کرتے تھے اس لیے انہوں نے باپ سے شکایت کی کہ وہ اس باب میں ان پر اعتماد کیوں نہیں کرتے۔ اس پر حضرت یعقوبؑ نے کہا کہ بات عدم اعتماد کی نہیں۔

(۱۲/۱۳) قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

" باپ نے کہا کہ (بے اعتمادی کی بات نہیں) مجھے خطرہ یہ ہے کہ تم اسے جنگل میں سیر و تفریح کیلئے ساتھ لے جاؤ، اور ذرا سی غفلت برتو، تو اسے بھیڑیا کھا جائے۔"

قرآن کریم نے اس کی تصریح نہیں کی کہ اس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر کیا تھی۔ حضرت یعقوبؑ کے بیان کردہ خدشہ سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کی اس وقت عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔ تورات کا بیان ہے کہ اس وقت ان کی عمر سترہ برس کی تھی۔

یعقوبؑ کا احوال یہ ہے کہ یوسفؑ سترہ برس کا ہو کے اپنے بھائیوں کے ساتھ گلہ چراتا تھا اور وہ جوان اپنے باپ کی جورؤوں، بلہاہ اور زلفاہ کے بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا اور یوسفؑ ان کے باپ کے پاس ان کے برے کاموں کی خبر لاتا تھا۔　　(پیدائش۔ ۳۷/۲)

لیکن قرآن کریم میں بیان کردہ حضرت یعقوبؑ کے خدشہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ بہرحال۔ باپ کے اس خدشہ پر بیٹوں نے کہا:

(۱۲/۱۴) قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

انہوں نے کہا کہ ابا جان! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اتنے بڑے جتھے کی موجودگی میں بھی اسے بھیڑیا کھا گیا (تو حیف ہے ہمارے جینے پر!) اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ ہم بالکل ہی گئے گزرے

ہو گئے"۔

گلہ بانی کی زندگی میں بھیڑیوں کے حملے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ حضرت یعقوبؑ نے اس خیال سے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیٹوں کی بدخواہ طبیعت نے اِس چیز کو اپنے سلسلۂ مکر و فریب کی ایک کڑی بنانے کے لیے گرہ میں باندھ لیا۔ بھائی اُنہیں ساتھ لے گئے اور اپنی طے شدہ خفیہ تجویز کے مطابق حضرت یوسفؑ کو ایک اندھے کنوئیں میں گرا دیا۔

۱۲/۱۵ فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ج

چنانچہ وہ یوسفؑ کو ساتھ لے گئے، اور سب اِس بات پر متفق ہو گئے کہ اِسے گہرے کنوئیں میں گرا دیا جائے"۔

یوسفؑ درچاہ

ذرا اندازہ لگائیے اس جگر گداز سانحہ اور ہوش رُبا منظر کا، کہ باپ کا چہیتا بیٹا، اپنے بھائیوں کے ہاتھوں، زندہ درگور کیا جا رہا ہے۔ اس بھیانک قبر میں حضرت یوسفؑ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ لیکن اُدھر اُنھوں نے حضرت یوسفؑ کو (بزعم خویش) دُنیا کے تمام اسباب و علائق سے منقطع کیا اور اِدھر اسباب و علل کے مالکِ حقیقی نے فوراً وحی بھیجی کہ مت گھبراؤ!

۱۲/۱۵ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۱۵﴾

"(عین اُس وقت جب وہ یوسفؑ کو کنوئیں میں گرا رہے تھے) ہم نے اُسے وحی کے ذریعہ بتا دیا کہ (تم بالکل نہ گھبراؤ، تم صحیح و سلامت رہو گے۔ اور اس کے بعد ایک دن ایسا آئے گا کہ) تم اُنہیں بتاؤ گے کہ اُنہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا اور اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ تم زندہ کیسے رہ گئے اور اس مقام تک کیسے پہنچ گئے)"۔ (۱۲/۹)

بھائیوں کی واپسی

مکر و فریب کے یہ سنگدل مجسّمے شام کے قریب گھر لوٹے لیکن عجیب ڈھونگ رچائے ہوئے:

۱۲/۱۶ وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ﴿۱۶﴾

"(یوسفؑ کو کنوئیں میں گرا دینے کے بعد) وہ رات کو اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے"۔

اور کہا:

۱۲/۱۷ قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾

"اور کہا کہ ابّا جان! ہم جنگل میں گئے تو یوُسفؑ کو سامان کے پاس بٹھا دیا اور ہم دوڑ میں مصرُوف ہو گئے کہ دیکھیں، کون آگے نکلتا ہے۔ اتنے میں ایک بھیڑیا آیا اور اُس نے یوُسفؑ کو پھاڑ کھایا۔
ہم جانتے ہیں کہ خواہ ہم کتنے ہی سچّے کیوں نہ ہوں، آپ ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے۔
لیکن واقعہ یہی ہے جو ہم نے آپ سے بیان کر دیا ہے۔"

آیت کے آخری ٹکڑے پر پھر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ برادرانِ یوسفؑ کے قلبِ خائن (GUILTY CONSCIENCE) کی دھڑکنیں اُن کے مکر و فریب کے چلمنی پردوں سے کس طرح پھٹ پھٹ کر باہر آ رہی ہیں ۔" اگرچہ ہم کتنے ہی سچّے کیوں نہ ہوں، آپ تو ہمارا یقین کریں گے ہی نہیں"۔ نفسِ نیم شعُوری (SUBCONSCIOUS MIND) کی بے تابانہ لیکن غیر محسُوس کیفیت کا ایسا نقشہ قرآن کریم کے اسلوبِ بیان کی خصوُصیت ہے۔ انہوں نے فریب کارانہ طور پر رونا دھونا بھی شرُوع کیا اور ساتھ ہی اس مکر کی تکمیل کے لیے حضرت یوُسفؑ کے کرُتے پر جھوُٹ مُوٹ کا خُون بھی لگا لائے تاکہ اسے بطورِ شہادت پیش کر دیا جائے:

۱۲/۱۸ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ

اور وہ یوُسفؑ کے کرُتے پر جھوُٹ مُوٹ کا خُون بھی لگا کر ساتھ لے آئے تھے۔"

اُنہوں نے اپنی طرف سے تو اس سوانگ میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن ایک صاحبِ فراست کی نگہِ بصیرت کے لیے اس قسم کے جھوٹ اور سچ میں فرق کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ کیوں یوُنہی باتیں بنا رہے ہو۔ یہ ساری کہانی تمہارے فریبِ نفس کے سوا کچھ نہیں۔

۱۲/۱۸ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

"باپ نے اس داستان کو سُن کر اور کُرتے کو دیکھ کر کہا کہ یُوسفؑ کو بھیڑیے نے بالکل نہیں کھایا۔ یہ سب تمہاری خود ساختہ کہانی ہے) جسے تمہارے فریبِ نفس نے تمہیں بڑا خوشنما بنا کر دکھایا ہے (کہ یہ تدبیر بڑی کامیاب رہے گی)۔ بہرحال، میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں صبر اور ہمّت سے کام لوں (اور گھر کا شیرازہ بکھرنے نہ دوں) اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو، اس پر خُدا سے مدد مانگوں۔"

اُدھر یہ ہو رہا تھا، اِدھر ایسا ہُوا کہ ایک قافلہ کا گزر اس راستہ سے ہُوا جس پر وہ کنواں پڑتا تھا جس میں حضرت یُوسفؑ کو گرایا گیا تھا۔

۱۲/۱۹ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾

"اُدھر ایسا ہُوا کہ جنگل میں ایک قافلہ آیا اور اُنہوں نے اپنے پیش رَس کو پانی کی تلاش میں بھیجا۔ وہ اس کنوئیں پر پہنچا اور اس میں ڈول لٹکایا۔ (نیچے سے یوسفؑ نے آواز دی۔ اُس نے کنوئیں میں جھانکا تو دیکھا کہ وہاں ایک لڑکا ہے)۔ اُس نے دُوسرے افرادِ کارواں کو آواز دی اور کہا کہ ایک خوشخبری سنو! کنوئیں سے ایک لڑکا مِلا ہے۔ اُنہوں نے اُسے چھُپا کر رکھ لیا کہ کہیں دُور لے جا کر فروخت کرینگے۔ اُنہوں نے یہ کچھ لوگوں کی نگاہوں سے چھُپا کر کیا۔ لیکن خُدا تو سب کچھ دیکھ رہا تھا۔"

تورات[1] میں ہے کہ یہ قافلہ اسمٰعیلی عربوں کا تھا جو اپنا سامانِ تجارت لے کر مصر جا رہا تھا۔ نیز یہ کہ حضرت یُوسفؑ کے بھائیوں نے اُنھیں بیس سکّوں کے عوض قافلہ والوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ لیکن قرآن کریم کا یہ بیان ہے کہ اہلِ قافلہ نے انھیں چھُپا کر رکھ لیا تھا کہ اُن کا کوئی دعویدار نہ آنکلے۔ آج بھی خانہ بدوش قبائل جو اس قسم کی بَردہ فروشی کرتے ہیں، ہاتھ پڑے بچّوں کو اسی طرح چھُپا کر کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔

اب حضرت یوسفؑ کی زندگی کا ایک نیا دَور شرُوع ہوتا ہے (اور اندازہ لگائیے کہ کس رُوح فرسا مرحلہ سے شرُوع ہوتا ہے)۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فلسطین کی زندگی بدوی زندگی تھی، جیسے جنگلوں میں مویشی چرانے والوں کی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مصر اُس زمانہ میں تمدّن و حضارت کی ان بلندیوں پر تھا کہ آج بھی جب اس کے نوادرات کے زمین دوز دفینے باہر نکلتے ہیں تو چشمِ حیرت کھُلی کی کھُلی رہ جاتی ہے کہ وہ زمانہ اور اس قسم کے تہذیب و تمدّن کے نمُونے! جس طرح آج بھی شہروں کی "مہذّب" آبادی کے نزدیک گاؤں والوں کی غیر مہذّب زندگی نفرت کی نگاہ سے

[1] پیدائش۔ باب ۳۷: ۲۵-۲۸

دیکھی جاتی ہے۔ اہلِ مصر، اپنے گرد و پیش کے چرواہوں کو سخت حقارت سے دیکھتے تھے۔ بہرحال، صحرائی علاقہ کے چرواہوں کا ایک لڑکا مصر کی آبادی میں پہنچتا ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ ایک اجنبی قافلہ والوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے جو اسے بازار میں جنس کی طرح بیچنے کے لیے لیے جا رہے ہیں۔

۱۲/۲۰ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

"قافلہ والوں نے، یوسفؑ کو (مصر کے بازار میں ظلم و تعدّی سے (جیسا کہ غلاموں کی خرید و فروخت میں ہُوا کرتا تھا۔ ویسے بھی انسانوں کی خرید و فروخت قرآن کی رُو سے بہرحال ظلم و زیادتی ہے۔ بخس کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے) معمولی سی قیمت پر جو چند درہموں سے زیادہ نہ تھی، بیچ ڈالا۔ انھوں نے اس کی فروخت میں بے رغبتی سے کام لیا، (اس لیے کہ ایک تو انہیں یہ مال مُفت ملا تھا اور دوسرے انھیں خیال ہوگا کہ اس کا کوئی دعویدار نکل آیا تو مشکل ہو جائے گی)۔"

اُنہوں نے اس "غلام"، کو سرِ بازار فروخت کر دیا اور چونکہ مال مُفت ہاتھ آگیا تھا اس لیے اس کی بھی چنداں پروا نہ کی کہ کتنے میں بِک رہا ہے، جو کسی نے دیا، لینے کی کی۔

اللہ اکبر! غلام، اور اس بے قدری سے بِکا ہُوا غلام! یُوں مصر میں داخلہ ہُوا۔ تورات میں ہے کہ جس شخص نے حضرت یوسفؑ کو خریدا تھا، اُس کا نام فوطیفار تھا۔

اور مدیانیوں نے اسے مصر میں فوطیفار کے ہاتھ جو فرعون کا ایک امیر اور لشکر کا رئیس تھا، بیچا۔ (پیدائش ۳۷:۳۶)

قرآن کریم نے اُسے لفظ عزیز (بڑی عزت والا، یا صاحب اختیار) کے لقب سے پکارا ہے کہ مقصد اس کی حیثیت کا تعارف تھا نہ کہ اُس کے عہدے کا ذکر۔ عزیز نے حضرت یُوسفؑ کو ایک غلام کی حیثیت سے خریدا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اُس نے آپ کی راست بازی، دیانت داری، حُسنِ سیرت اور خُدا داد فراست سے اندازہ لگا لیا کہ یہ لڑکا اس قابل ہے کہ اس پر کُلی اعتماد کیا جائے اور گھر کا نظم و نسق اُس کے سپُرد کیا جائے۔ چنانچہ:

۱۲/۲۱ وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ

"جس شخص نے یوسفؑ کو خریدا تھا اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ (اِس لڑکے کے ساتھ عام غلاموں کا سا برتاؤ نہ کرنا بلکہ) عزت سے رکھنا (کیونکہ اس کے چہرے بُشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اچھے گھرانے کا لڑکا ہے۔ اِس لیے) ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارے لیے کسی فائدے کا موجب بن جائے یا ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔"

قرآنِ کریم نے اَکْرِمِیْ مَثْوٰىهُ (اسے عزت کے ساتھ رکھو) کہہ کر کہانی کا ایک بہت بڑا حصّہ دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ حیاتِ یوسفی میں پہلا انقلاب تھا۔ یعنی غلام کی حیثیت سے گھر میں داخل ہوئے، اور وہ بھی کنعانی غلام (یعنی مصریوں کے نزدیک ایک گنوار غلام) کی حیثیت سے اور چند ہی روز میں مصر کے ایک بہت بڑے صاحبِ منصب امیر کے گھر بار کے معتمد علیہ ناظم بن گئے۔

(۱۲/۲۱) وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اِس طرح ہم نے سرزمینِ مصر میں یوسفؑ کے پاؤں جما دیے اور ایسا انتظام کر دیا کہ اُس کی اچھی طرح سے تعلیم و تربیت ہوجائے اور اُس میں معاملہ فہمی اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔ اللہ اپنی اسکیموں کو کامیاب بنا کر رہتا ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں (کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہو رہا ہے)۔"

ذرا غور کیجئے، مشیت کی تدبیر کو اپنے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچنے کے لیے اسباب و علل کی کون کون سی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن عام انسانوں کی نگاہوں سے چونکہ یہ راز پنہاں ہوتا ہے اِس لیے وہ تدابیر کی ان کڑیوں کو سمجھ نہیں سکتے۔

اِس طرح حضرت یوسفؑ نے اس جدید ماحول میں پرورش پانا شروع کی:

(۱۲/۲۲) وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

"چنانچہ جب یوسفؑ (اِس قسم کے ماحول میں تربیت پاکر) جوان ہُوا تو وہ کارفرمائی اور جہان داری کے سلیقوں سے واقف اور علم و بصیرت کی فراوانی سے مالامال تھا۔ (یہ وہ چیزیں تھیں جو اُسے اپنی صحرائی زندگی میں میسّر نہیں آسکتی تھیں) لیکن اسے یہ حاصل اس لیے ہوگئیں کہ اُس نے یہاں نہایت حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی تھی۔

جو لوگ بھی اس طرح زندگی بسر کریں، اُنھیں اُس کا ایسا ہی صِلہ مِل سکتا ہے (وحی البتہ اس طرح نہیں مِل سکتی)۔"

جب حضرت یوسفؑ نے عُمر کے کچھ اور مراحل طے کر لیے تو اللہ تعالیٰ نے اُنھیں کارفرمائی کی قوّت اور علم کی نعمت سے سرفراز فرمایا اور یہ سب اُن کے حُسنِ عمل کی بدولت تھا۔ (وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ)۔ غور کیجئے قرآنِ کریم نے اِس پہلے انقلاب کے ساتھ ہی نگاہوں کو کس طرح قصّے سے عبرت و موعظت کی طرف مُلتفت کر دیا۔ یعنی یہ انقلاب یونہی اتفاقیہ سرزد نہیں ہوگیا تھا، بلکہ خُدا کے اُس اٹل قانون کے تحت واقع ہُوا تھا کہ حُسنِ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کا لازمی نتیجہ ایسا ہوتا ہے۔ (وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ)۔



اب اس زرّیں داستان کی اگلی کڑی شروع ہوتی ہے اور کاروانِ شوق اُس وادی میں داخل ہوتا ہے جہاں سیرت و کردار کی آزمائش کے لیے ترغیباتِ نفس کے صبر آزما اور نگاہ فریب مناظر، سامانِ صد ہزار بداماں لیے، دامِ ہمرنگِ زمیں کی طرح چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی عُمر اُس وقت بھرپور جوانی کی تھی۔ اُن کا ابتدائی زمانہ تمدّن و حضارت کی اعصاب شکن مصنوعی زندگی سے دُور، دشت و بیاباں کی کھُلی فضاؤں میں گزرا تھا۔ آج بھی اس کا اندازہ لگانا ہو کہ کھُلی فضائیں اور سادہ و بیباک زندگی، اِنسانی حُسن کو کس طرح نکھارتی ہے تو آزاد قبائل کے کسی بچے کو دیکھیے۔ افلاس و غربت کا یہ عالم کہ بدن پر کپڑے نہیں، چیتھڑے ہیں، لیکن صحت و تندرستی کو دیکھیے تو رگ رگ سے اغوانی موجیں تلاطم خیز ہیں۔ حُسن صحت کا نام ہے اور جب صحت و جوانی یکجا ہو جائیں تو ان کے امتزاج سے جذب و کیف کا ایک ایسا بلّوریں مجسّمہ وجود میں آجاتا ہے جس میں زندگی اپنی پوری توانائی و رعنائی سے مُرتسم دکھائی دیتی ہے۔ پھر رگوں میں خانوادۂ نبوّت کا صالح خون، ان تمام خصوصیات کے ساتھ حسن عفت سونے پر سُہاگہ۔ تندرست جوانی اگر قلب و نگاہ کی پاکیزگی میں گزرے تو اس سے بڑا حُسن اور کیا ہوسکتا ہے؟ — یہ ہیں حضرت یوسفؑ — اور دُوسری طرف عزیز کی بیوی — تہذیب و تمدّن کی بیباکیوں کی تخلیق، عشرت و کامرانی کے ماحول کی پروردہ، دَولت کی

مُرصّع کاریوں سے جگمگاتا حُسن۔ غرضیکہ دونوں طرف جذب و کشش کے پُورے پُورے سامان۔ لیکن ایک طرف جذباتِ نفس کی مکمل حکمرانی اور دُوسری طرف ترغیباتِ نفس پر حدُودُ اللہ کی حکمرانی۔ نتیجہ یہ کہ حضرت یُوسفؑ کا خیال کبھی بھُولے سے بھی اُدھر نہ گیا۔ لیکن عزیز کی بیوی کی دِل باختگی، آتشِ خاموش کی طرح سُلگتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن جوشِ فریفتگی نے شعلۂ بیباک کی صُورت اختیار کر لی۔ حضرت یوسفؑ کمرے کے اندر تھے۔ وہ عشوہ طرازیوں کا فتنۂ مجسّم، ہزاروں بجلیاں اپنے دامنِ نگاہ میں لیے وہاں آپہنچی۔ دروازے بند کر لیے اور ناز، ہزار نیاز مندیوں کے ساتھ ایک نگۂ التفات کے لیے مُلتجی ہُوا۔ قرآن کریم نے اس تمام واقعہ کو چند لفظوں میں سمو دیا ہے۔ فرمایا:

(۱۲/۲۳) وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٣﴾

"اور جس عورت کے گھر میں یُوسفؑ رہتا تھا (یعنی عزیز کی بیوی) وہ اس پر ریجھ گئی۔ لیکن یُوسف کی نیّت میں کبھی خرابی پیدا نہ ہُوئی۔ بالآخر، اُس عورت نے تہیّہ کر لیا کہ اسے بہلا پھسلا کر مجبُور کر دیا جائے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف اُس کی بات مان لے۔ چنانچہ اس نے ایک دِن مکان کے تمام دروازے بند کر دیے اور یُوسفؑ سے کہا کہ اِدھر آؤ۔

یُوسفؑ نے کہا کہ معاذ اللہ! (مجھ سے ایسی بات کبھی نہیں ہو سکتی)۔ میرے پروردگار نے مجھے سیرت و کردار کے ایسے بلند اور حسین مقام پر پہنچا دیا ہے۔ (کیا تو مجھے اس مقام سے نیچے گرانا چاہتی ہے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا)۔ یہ تو کھلی ہُوئی حدود فراموشی ہے اور حدود فراموش انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

لیکن اُس کی آتشِ جذبات کے شعلے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اس دیوانگی میں سب کچھ بھول کر مُعاملہ کی انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ذرا غور کیجئے۔ اُس کمرے کے اندر کوئی تیسرا دیکھنے والا نہ تھا۔ جذباتِ نفس کی تسکین کے پُورے سامان موجُود تھے۔ لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اس سیلاب انگیزیوں کے باوجود حضرت یُوسفؑ کے دامنِ عفت کو تر نہ ہونے دیا! فقط ایک اللہ کا خیال! یعنی اس بات پر ایمان اور غیر متزلزل ایمان کہ جب کوئی اور ---

دیکھنے والا نہ ہو تو ایک ذات ایسی ہوتی ہے جو سب کچھ دیکھتی ہے۔ اِس بات کا یقین کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُد سے ہر غلط کام اپنا تباہ کُن نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے خواہ اس پر کوئی گرفت کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ یہ تھا امرأۃ العزیزؔ اور اور حضرت یوسفؑ میں فرق۔ ایک کی آنکھ پر تحریصاتِ نفس کے گہرے پردے پڑے ہوئے تھے اور دوسرے کی نگہِ حقیقت رَس ایسے خود فراموش ماحول میں بھی قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ رہی تھی ورنہ انسان ہونے کی جہت سے جوانی کی اُمنگیں دونوں طرف تھیں۔ دیکھئے، قرآن کریم نے اس بیّن فرق کو ایجاز و اختصار کے باوجود کس حسین انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا:

(۱۲/۲۴) وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

"لیکن وہ عورت اِس بات کا تہیہ کر چکی تھی اور اُس نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ اگر یوسفؑ ـــــ ـــــ کے سامنے اپنے پروردگار کی درخشندہ و تابندہ اخلاقی قدر نہ ہوتی تو وہ بھی اس پر آمادہ ہو جاتا۔ اِس اخلاقی قدر کے پیشِ نظر رہنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ اس بے حیائی کے کام سے مجتنب رہا اور بُرائی کا مرتکب نہ ہُوا۔ اور یُوں اُس نے اپنے حُسنِ سیرت سے ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے مُخلص بندوں میں سے تھا۔ (بعد میں اِس کا اعتراف و اقرار خود اُس عورت نے بھی کر لیا کہ یُوسفؑ کی نیّت خراب نہیں ہوئی تھی۔ (۱۲/۵۱))۔"

داستان اس قدر پُرکیف، دلکش اور جاذب ہے کہ دلوں کا تقاضا ہے کہ

نگہ برہم مزن، تا نہ شکنی رنگ تماشا را

(آنکھ بھی نہ جھپکو، کہ اس سے رنگینیٔ تماشا میں شکن پڑ جائے گی!)

لیکن اس میں ایک مقام ایسا نازک اور اہم آگیا ہے جس کی وضاحت کیفِ داستان سے بھی زیادہ گراں بہا ہے۔ اس لیے ہم اِس گریز کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

آیت نمبر ۲۴ میں ہے: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ ہماری کتبِ تفاسیر میں بالعموم اس کا ایسا مفہوم بیان کیا گیا ہے جس سے دامنِ یُوسفؑ تار تار ہو جاتا ہے۔ ان مفاہیم کا ملخص

یہ ہے کہ اُس عورت نے غلط اقدام (بدکاری) کا ارادہ کر لیا اور حضرت یوسفؑ نے بھی اس کا ارادہ کر لیا لیکن وہ اس سے عملاً باز رہے کیونکہ اُنھوں نے "برہانِ ربّ" دیکھ لی تھی۔ ایسا کہنے والوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ فعلِ بد کا قصد و ارادہ، عملِ بد سے کم معصیت نہیں ہوتا۔

قرآنِ کریم کی رُو سے قصد و ارادہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اُس نے قتلِ عمد (بالارادہ) کی سزا موت مقرر کی ہے اور قتلِ خطا (بلا ارادہ) کے لیے صرف خون بہا (دیت) ادا کرنے کا کہا ہے (۴/۹۲-۹۳) اُس نے عام معاشرتی معاملات میں بلا ارادہ لغزش کو قابلِ مؤاخذہ قرار نہیں دیا۔ قابلِ مواخذہ وہ ہے جس میں دل کا ارادہ شامل ہو۔ (مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ۔ ۳۳/۵)۔ اس کی تائید اِس دُعا سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج (۲/۲۸۶) — یعنی جو لغزش سہواً یا بلا ارادہ ہو جائے اس پر مؤاخذہ نہ ہو۔ اِس سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے ظلم سنگین جُرم ہے لیکن ظُلم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظُلم وہ ہے جو دُوسرے پر کیا جائے۔ دُوسرا ظُلم وہ ہے جو خود اپنے آپ پر کیا جائے۔ (وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۲/۵۷) اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ کسی شخص پر آپ بالارادہ زیادتی کرتے ہیں۔ اِس زیادتی کا جو اثر اُس پر ہُوا وہ تو اُس پر ظلم ہُوا۔ لیکن اِس کا جو اثر آپ کی ذات پر ہُوا، وہ آپ کا اپنے آپ پر ظُلم ہے۔ دُوسری شکل یہ ہے کہ آپ سے کسی کے خلاف بلا ارادہ زیادتی سرزد ہو گئی۔ اِس سے اُس پر تو ظُلم ہُوا ہے مگر آپ کا اپنے آپ پر ظلم نہیں ہُوا۔ تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی پر زیادتی کا ارادہ کیا لیکن وہ زیادتی عمل میں نہیں آئی۔ اِس سے اُس شخص پر تو ظُلم نہیں ہُوا، لیکن آپ کا اپنے آپ پر ظلم ہو گیا ہے۔ قصّۂ زیرِ نظر میں، اس عملِ شنیع کا ارتکاب تو نہیں ہُوا، لیکن وہ عورت مُجرم قرار پا گئی کیونکہ اُس نے اِس کا ارادہ کیا تھا۔ اگر حضرت یُوسفؑ کے متعلق بھی یہ خیال کر لیا جائے کہ اُنھوں نے بھی اُس کا ارادہ کر لیا تھا تو ان میں اور اُس عورت میں فرق کیا ہو گا۔؟ لہٰذا یہ کہنا کہ حضرت یُوسفؑ نے بھی اس کا ارادہ کر لیا تھا لیکن وہ اپنے ارادے کو عمل میں نہ لا سکے کیونکہ اُنہوں نے اپنے ربّ کی بُرھان دیکھ لی تھی، ایک نبیؑ کے شایانِ شان نہیں۔

پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ حضرت یُوسفؑ نے پہلے فقرہ میں کہا ہے: (۱) مَعَاذَ اللّٰهِ: میں قوانینِ خداوندی اور اقدارِ الٰہیہ کی پناہ طلب کرتا ہوں؛ پھر کہا: (۲) اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ۔ میرے ربّ نے مجھے حُسنِ سیرت سے نوازا ہے۔ میں اِس آئینے کو کس طرح داغدار کر سکتا ہوں؟ اور اس کے بعد کُھلے الفاظ میں خدا کا یہ فیصلہ کہ: (۳) اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ اس کے قانونِ مکافات کی رُو سے ظالم کبھی پنپ نہیں سکتا۔

اور زنا تو صریح ظلم ہے ——— اِن نظریات کا حامل اور ان ارادوں کا مالک یُوسفؑ کبھی فحش کاری کا قصد کر سکتا تھا؟ — (معاذ اللہ! ۔ ثم معاذ اللہ)۔ آیت کا مطلب واضح ہے کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے کہ جس طرح عزیز کی بیوی اس اقدام کا قصد کر چکی تھی (کیونکہ اُس کے سامنے اقدارِ خداوندی نہ تھیں) اِسی طرح اگر فریقِ مقابل بھی ایسا ہی ہوتا جس کے سامنے اقدارِ خداوندی نہ ہوتیں، تو وہ بھی اس کا قصد کر لیتا۔ لیکن حضرت یُوسفؑ کے سامنے چونکہ بُرھانِ خداوندی تھی، اِس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کا قصد کرتے۔ قرآن کریم نے یہاں دو رُجحاناتِ قلبی کا فرق نمایاں کیا ہے۔ ایک اُس کا رُجحان جو کسی بلند قدر کا پابند نہ ہو۔ دُوسرا اُس کا جو اپنے آپ کو ان اقدار کا پابند سمجھے۔ اوّل الذکر کی نظیر عزیز کی بیوی کی تھی۔ ثانی الذکر کی آئینہ دار سیرتِ یُوسفی!

(حضرت) یوسفؑ نے جو "برُھانِ ربّ" دیکھی تھی اس کے متعلق بھی ہماری کتبِ تفاسیر میں عجیب و غریب افسانے ملتے ہیں۔ ان میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ:

> حضرت یوسفؑ نے اپنے والد (حضرت یعقوبؑ) کو دیکھا کہ وہ اپنی اُنگلی منہ میں ڈالے کھڑے ہیں اور حضرت یوسفؑ کے سینے پر اُس نے ہاتھ مارا۔ (تفسیر ابن کثیر۔ بارہواں پارہ صـ۱۴)

اللہ تعالیٰ نے اپنے ضابطۂ اقدار و قوانین (قرآن) کو بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ کہہ کر پکارا ہے (۴/۱۷۴)۔ اس لیے خدا کا ہر حکم، اُس کا ہر قانون، اُس کی ہر قدر بُرہانِ خداوندی ہے۔ حضرت یوسفؑ نے جو کہا تھا کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۲/۲۳)، تو یہ سب سے بڑی بُرہانِ خداوندی تھی جو اُن کے پیشِ نظر تھی اور اس سے وہ اس غلط اقدام کے قصد سے باز رہے تھے۔

اور سب سے بڑی دلیل وہ جسے خُود خدا نے اِن الفاظ میں بیان کر دیا کہ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۱۲/۲۴) وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا جن کے متعلق خود ابلیس نے کہا تھا:

> قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (۱۵/۳۹-۴۰)

وہ اُس نے کہا کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے جو اس طرح زندگی کی سعادتوں سے محروم کر دیا اور مجھ پر خوشگواریوں کی راہ مسدود کر دی تو میں بھی اب ایسا کروں گا کہ انسانوں کو، ان کی طبیعی زندگی کے مفاد و اسباب اس طرح خوشنما بنا کر دکھاؤں گا کہ وہ اُنہی میں اُلجھ کر رہ جائیں اور انسانی زندگی کے بلند مقاصد کو یکسر نظر انداز کر دیں (اور یوں، میری طرح یہ بھی زندگی کی حقیقی سعادتوں سے محروم رہ

جائیں۔ (۱۵/۳۹)

ہاں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے اُن پر میرا زور نہیں چل سکے گا (وہ اپنے آپ کو وحی کے تابع رکھیں گے۔ اس لیے سرکش جذبات ان پر غالب نہیں آسکیں گے۔" (۱۵/۴۰)

اور خدا نے کہا تھا کہ :

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ۔ (۱۵/۴۲)

"میرے اِن (مخلص) بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا، تیرا غلبہ اُنہی پر ہو سکے گا جو اس متوازن راہ کو چھوڑ کر تیرے پیچھے لگ جائیں۔"

اِس لیے حضرت یوسفؑ اِن نظر فریب مناظر کے دامِ تزویر میں کس طرح آسکتے تھے! اللہ کے بندے اِن تمام خار دار جھاڑیوں سے اپنا دامن صاف بچا کر نکل جاتے ہیں ؎

بندۂ را کہ بفرمانِ خدا راہ رَوَد
نگذارند کہ در بندِ زلیخا ماند (غالب)

اب آئیے اِس داستانِ نور و نکہت کی اگلی کڑی کی طرف۔ (حضرت) یوسفؑ کے انکار پر وہ عورت، جذبات سے بے قابو ہو کر دست درازی تک اُتر آئی۔ حضرت یوسفؑ دامن چھڑا کر بھاگے کہ کمرے سے باہر نکل جائیں، وہ عورت بھی لپکی کہ آگے بڑھ کر اُنہیں روک لے ۔

(۱۲/۲۵) وَاسْتَبَقَا الْبَابَ...

"یوسفؑ، دروازے کی طرف بھاگا کہ کسی طرح باہر نکل جائے اور وہ عورت اس کے پیچھے بھاگی کہ اُسے نکلنے نہ دے۔"

وہ دونوں دروازے کی طرف لپکنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ وہ حضرت یوسفؑ سے آگے نہ بڑھ سکی تو پیچھے سے کُرتہ پکڑ لیا اور وہ پھٹ گیا :

(۱۲/۲۵) وَقَدَّتْ قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ...

عورت نے پیچھے سے یوسفؑ کا کُرتہ پکڑ لیا، لیکن یوسفؑ تیزی سے آگے بڑھ گیا اور اُس کا کُرتہ

پیچھے سے پھٹ گیا۔"

اور سامنے ؟ ۔ لیکن اتنے میں حضرت یوسفؑ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ دروازہ کھلا تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے اُس عورت کا خاوند کھڑا ہے :

۱۲/۲۵ وَاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ط...

"اور ان دونوں نے دیکھا کہ عورت کا خاوند دروازہ کے سامنے کھڑا ہے۔"

اِس اچانک سانحے نے امرأۃ العزیز کے قلب کے ہیجان کا رُخ بدل دیا۔ بالآخر بوالہوس ہی تو تھی۔ فوراً اس ذلیل ترین حربہ پر اُتر آئی جو اس قسم کے کیریکٹر کا خاصہ ہوا کرتا ہے :

۱۲/۲۵ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

"(اُس عورت نے ایک سیکنڈ میں بات بنا ڈالی اور جھٹ سے اپنے خاوند سے کہا کہ) جو شخص تیری بیوی سے بدکاری کا ارادہ کرے، اُس کی سزا کیا ہونی چاہیئے ؟ کیا اُس کی سزا یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ اُسے جیل خانہ بھجوا دیا جائے ؟ یا اُسے — اس سے بھی زیادہ الم انگیز سزا دی جائے !"

حضرت یوسفؑ نے فرمایا :

۱۲/۲۶ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ ...

"اِس پر یوسفؑ نے کہا کہ یہ جھوٹ بولتی ہے۔ خود اُسی نے یہ سب مکر و فریب کیا اور مجھے مجبور کرتی رہی کہ میں اِس فعلِ شنیع کا مرتکب ہو جاؤں۔ (لیکن میں اس سے دامن چھڑا کر بھاگ نکلا۔)"

وہ اُنہیں مُلزم قرار دے رہی ہے، اور یہ نہ صرف اقبالِ جُرم سے منکر ہیں، بلکہ اُسے مُلزم ٹھہراتے ہیں۔ کمرے کے اندر کوئی تیسرا تھا نہیں۔ حضرت یوسفؑ اپنی بریّت میں کیسے بطور گواہ پیش کر سکتے تھے ؟ لیکن جب بات آگے بڑھی تو خود اُس عورت کے خاندان میں سے ایک صاحبِ دانش اور

شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا

حقیقت شناس نے کہا کہ جب کوئی اور گواہی نہیں مل سکتی تو احوال و کوائف کی گواہی (CIRCUMSTANTIAL EVIDENCE) کو دیکھنا چاہیے۔

۱۲/۲۶—۲۷ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ج اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ

مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٦﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾

"(بات آگے بڑھی تو) خود اُس عورت کے خاندان میں سے ایک پسندیدہ شخص نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر یوسفؑ کا کُرتہ آگے سے پھٹا ہے تو یہ عورت سچّی ہے اور یوسفؑ جھوٹا۔ اور اگر کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی، اور یوسفؑ سچّا ہے۔"

اُس نے ایک اصول متعیّن کر دیا جو فی الواقعہ فیصلہ کُن تھا۔ عزیز نے جب دیکھا تو حضرت یوسفؑ کا کُرتہ پیچھے سے پھٹ رہا تھا، جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کی بیوی انہیں پیچھے سے پکڑ کر روکنے کے لیے کوشاں تھی۔

[۱۲/۲۸] فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾

"چنانچہ جب کُرتے کو دیکھا تو وہ پیچھے سے پھٹا تھا (اس سے واضح ہو گیا کہ یوسف سچّا ہے اور عورت جھوٹی) اِس پر اُس عورت کے خاوند نے (بیوی سے) کہا کہ تم عورتیں بڑی مکّار ہوتی ہو۔ تمہاری مکّاریوں سے خُدا کی پناہ! تمھاری چالیں کس قدر گہری اور تمھارے فریب کس قدر خطرناک ہوتے ہیں۔"

اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ پر غور کیجیے۔ صاف نظر آتا ہے کہ اُس زمانہ تہذیب و تمدّن میں عورتوں کے متعلق عام خیال کیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ عزیزِ مصر کا قول ہے۔ لیکن بعض سادہ لوح اس فقرہ کو جنسِ نسواں کے مکر و فریب کی تائید میں بطورِ آسمانی شہادت پیش کرتے ہیں۔ یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! عورتیں ہوتی ہی مکر و فریب کی گٹھڑیاں ہیں۔ دیکھئے قرآن کریم میں ہے: اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ[1] لیکن قرآن کا دامن اِن اتہامات سے پاک ہے۔ اُس کے نزدیک مرد نہ محض مرد ہونے کی حیثیت سے دیانت داری اور راست بازی کا مجسّمہ ہے اور نہ عورت محض عورت ہونے کی جہت سے مکر و فریب کی پیکر۔ دیانت و امانت اور مکر و فریب کی استعداد دونوں میں موجود ہے اور دونوں اپنے اپنے اعمال کے مطابق واجبُ التکریم یا مستوجبِ نفرین ہیں۔

اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ

---

[1] اس قسم کے مقبولِ عام مقولے جب شاعروں کے ہتھے چڑھ جائیں تو پھر پوچھئے نہ کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ (ہیر وارث شاہ پنجابی (باقی اگلے صفحہ پر)

یہاں پر ایک ثانیہ کے لیے رُکیے۔ جُرم کے اثبات کے لیے بالعموم عینی شاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن نظامِ عدل میں ایک اور شہادت کو بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور وہ شہادت ہے واقعاتی یا احوالی (CIRCUMSTANCIAL) یعنی موقعہ کے احوال و کوائف کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ دورِ حاضر میں اِن کوائف کے مطالعہ نے سائنٹیفک اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس میں طبیعی تحقیق و تفتیش بھی شامل ہے۔ مثلاً مقتول کے خون کا ٹیسٹ، ضرب اور آلۂ ضرب کا باہمی تعلق وغیرہ۔ اِن شواہد کو بالعموم دورِ حاضر یا دورِ تمدّن کی خصوصیات سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن کے اِس بیان کی رُو سے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ماضی کے اِس قدر بعید زمانہ میں بھی واقعاتی شہادت کو اس قدر اہمیت دی جاتی تھی۔ زیرِ نظر شاہد نے واقعاتی شہادت کی رُو سے یہ ثابت کیا ہے کہ مُجرم عورت ہے، نہ کہ (حضرت) یوسفؑ۔ اگرچہ اس ذریعۂ اثباتِ جرم کو قرآنِ کریم نے اپنی طرف سے پیش نہیں کیا، لیکن جس انداز سے اُس نے اس کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اِسے اُس کی تائید حاصل ہے۔ اگر وہ اس کے حق میں نہ ہوتا تو کہہ دیتا کہ اثباتِ جرم کا یہ طریق قابلِ قبول نہیں قرار پا سکتا۔ بہرحال، جرائم کی تفتیش اور فیصلہ کے سلسلہ میں واقعاتی شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

لیکن جو قوانین پاکستان میں نافذ کئے گئے (اور نافذ کیے جا رہے ہیں[1])۔ ان میں اثباتِ جُرم کے لیے طریق ہی الگ اختیار کیا گیا ہے۔ جُرمِ زنا کے سلسلہ میں مطالبُ الفرقان جلد چہارم (صفحہ ۲۹۵) دیکھئے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اس جُرم کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ چار گواہ اس کی شہادت دیں کہ انہوں نے عملِ دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اگر چار عینی گواہ نہ ہوں، یا اُن میں کسی ایک جزئی بات میں بھی اختلاف ہو، تو مُلزم بری ہو جائے گا اور گواہ مُجرم قرار پا جائیں گے۔ فقہ حنفی کی مشہور اور مستند کتاب "فتاویٰ عالمگیری" میں ہے کہ "اگر تین گواہوں نے عینی گواہی دے دی اور چوتھے گواہ نے بھی ان کی تائید تو کر دی لیکن کہا یہ کہ اُس نے مُلزم مرد اور عورت کو ایک لحاف میں دیکھا تھا، تو

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گزشتہ) زبان کی کلاسیکی شاعری کی شاہکار ہے۔ اس میں عورتوں کے متعلق کہا ہے "ایہہ تریتاں مکر دیاں کُتیاں نیں"۔ عورتیں مکر و فریب کی کُتیاں ہیں۔ آک (مدار) کا پودا بڑا زہریلا ہوتا ہے۔ اس میں جو پھل لگتا ہے اس کی شکل آم کی سی ہوتی ہے لیکن اندر زہر سے بھرا ہوتا ہے۔ اُسے کُتّی کہتے ہیں جس کی جمع کُتّیاں ہے۔ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ وارث شاہ عورتوں کے متعلق کیا کہہ گیا ہے جو ضرب المثل بن چکا ہے۔ سند اس کی اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ ۔ کُنّ سے کُتّی۔

[1] یہ سطور ۱۹۸۲ء میں قلمبند کی جا رہی ہیں۔

اِس سے اس ملزم پر حد (سزا) جاری نہیں ہوگی اور پہلے تین گواہوں کو جرم قذف (جھوٹی تہمت لگانے) کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور اُنہیں اَسّی اَسّی کوڑے مارے جائیں گے۔" (فتاوٰی عالمگیری۔ اُردو ترجمہ۔ صفحہ ۳۴۲،

بحوالہ طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۷۹ء صفحہ ۱)

اِن قوانین کے نفاذ کے وقت، طلوع اسلام نے ان پر تفصیلی تبصرہ کیا اور کہا کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ اِن کی رُو سے کسی ملزم کے خلاف جُرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۷۹ء تا اکتوبر ۱۹۷۹ء) لیکن اِس دَور میں قرآن کی آواز سُننے کے لیے کون تیار ہوتا ہے؟ اس کے بعد خود صدرِ مملکت، جنرل محمد ضیاء الحق، نے اعتراف کیا کہ جس قسم کی شہادت کو شرط قرار دیا گیا ہے اُس کی رُو سے جُرم ثابت ہی نہیں ہو سکے گا۔ یہ قوانین (حدود آرڈیننس) فروری ۱۹۷۹ء میں نافذ ہوئے تھے۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد، اُنہوں نے امریکہ کی (C.B.S.) کی ٹی۔ وی ٹیم کو ایک اِنٹرویو دیا تھا۔ اِنٹرویو لینے والوں نے اعتراض کیا کہ یہ قوانین بڑے وحشیانہ ہیں۔ اس کے جواب میں صدرِ مملکت نے فرمایا تھا:

> یہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں اِس کی وضاحت کر دوں گا۔ اِسلام، سزا کے بجائے، تخویف (DETERRENCE) پر زور دیتا ہے۔ اگر آپ اِس فلسفہ پر نگاہ رکھیں گے جو ان سنگین سزاؤں کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس قانونِ شہادت کی رُو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے، ایک فی ہزار مجرموں کو بھی سزائیں نہیں دی جا سکیں گی۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۹ء۔ بحوالہ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۸۲ء)

ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے بین الاقوامی شہرت کے حامل میگزین (ASIA WEEK) کے ایڈیٹر انچیف (MICHAEL O'NEILL) نے اواخر ۱۹۸۱ء میں صدرِ مملکت سے مُلاقات کی جس کی رپورٹ اِس جریدہ کی ۴ دسمبر ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اِس میں ان قوانین کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ اس کے اس اِعتراض کے جواب میں کہ (اِن قوانین کی رُو سے) کسی مجرم کو سزا دی ہی نہیں جا سکے گی، صدرِ مملکت نے کہا:

> یہ ٹھیک ہے۔ ایسا نہیں کیا جاتا۔ آپ لوگوں کو سنگسار نہیں کر سکتے۔ قرآنی قوانین کا بُنیادی فلسفہ یہ ہے کہ تمہارے ہاں ایسی قوت ہونی چاہیئے جو لوگوں کو ارتکابِ جرم سے باز رکھ سکے۔ ذرا سوچو کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے چار گواہ مِل سکیں جو شہادت دیں کہ اُنہوں نے عملِ دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایسا ناممکن ہے[1]

(طلوع اسلام۔ جنوری ۱۹۸۲ء)

---

[1] اِن قوانین کی رُو سے عورت کی شہادت بھی قابلِ قبول نہیں ہوگی۔

لیکن اِس کے باوجود یہ قوانین مملکتِ پاکستان میں بدستور موجود ہیں۔ یہ قوانین درحقیقت اُن فقہی قوانین پر مبنی ہیں جو آج سے ہزار سال پہلے ہمارے دورِ ملوکیت میں اُس زمانے کے مقنّنین نے مرتّب کیے تھے اور ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری میں اس قسم کے جرائم بالعموم اوپر کے طبقہ میں عام ہوتے ہیں۔ (ہم کسی کی نیّت پر شُبہ کرنا نہیں چاہتے، لیکن نظر ایسا آتا ہے کہ) ان جرائم کی سزائیں تو نہایت سخت رکھی گئیں لیکن انہیں شرائط ایسی کے ساتھ مشروط کر دیا کہ جن کی رُو سے جرم ثابت ہی نہ ہو سکے — نہ جُرم ثابت ہو، نہ سزا مل سکے۔

لیکن یہ قوانین نہ اسلامی تھے، نہ اَبدی کہ ہم پر ان کی پابندی لازم ہو۔ اُمتِ مسلمہ کے لیے خُدا کی کتاب (قرآن) ابدی اور غیر متغیّر ضابطۂ حیات ہے جس کے احکام و قوانین، ہر دَور کی اُمت (یعنی اسلامی مملکت) اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر، باہمی مشاورت سے نافذ کرے گی۔ (واضح رہے کہ اسلامی مملکت اسے کہتے ہیں جس کا تمام کاروبار قرآنِ کریم کی حدُود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے)۔ قرآنِ کریم نے جرمِ زنا کے ثبوت کے لیے عینی شاہدوں کی شرط عاید کی ہے، نہ رجم (سنگسار کرنے) کو اس کی سزا قرار دیا ہے۔ (جرائم اور ان کی قرآنی سزاؤں کے متعلق مطالب الفرقان جلد چہارم (صہ ۲۹۹ تا آخر) دیکھیے۔)

اب پھر سلسلۂ داستان کو لیجیے۔ عزیزِ مصر نے اپنی بیوی کی تو اس طرح ملامت کی اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ اِس معاملہ کو رفت گزشت کرو۔ ان کی بریّت کی توثیق کے لیے ایک مرتبہ پھر اپنی بیوی سے کہا کہ اپنی خطاؤں کی معافی مانگو، جُرم تیرا ہی ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں ہے:

۱۲/۲۹ يُوسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۜ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾

(حضرت) یوسفؑ سے کہا کہ (میاں صاحبزادے!) اس معاملہ سے درگزر کرو۔ (اِس پر مٹی ڈالو۔ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں[1]۔ کیا کیا جائے)۔ پھر بیوی سے کہا کہ تم خطا کار رہو۔ یوسفؑ سے اپنے قصُور کی معافی مانگو۔"

اِس سے ضمناً یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس تمدّن میں جس کی بُنیاد خُدا فراموشی پر ہو اور جس میں اخلاق باختگی عام ہو جائے انسان میں غیرت و حمیّت کا کتنا عنصر باقی رہ جاتا ہے، کسی بدوی قبیلہ میں یہی واقعہ ہوتا (جو مہذّب شہریوں کے نزدیک

[1] اِس قسم کے معاشرہ میں غیرت کا جنازہ نکل چکا ہوتا ہے۔

جاہل اور گنوار ہوتے ہیں) تو خاوند کی غیرت ایسی بیوی کی گردن اُڑا دیتی۔ لیکن اس "تہذیب کے فرزند" کو دیکھئے کہ آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ ہُوا۔ بیوی کا جُرم ثابت ہوگیا اور اس پر بیوی سے زیادہ سے زیادہ کہا تو فقط اتنا کہ تُمھارا فرقہ بڑا ہی مکار ہے اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ میاں صاحبزادے! اِس قصّے کو آگے نہ بڑھانا۔ یہیں ختم کر دینا۔

یہ آج سے چار ہزار سال بیشتر کی تہذیبِ مصر ہی کا نتیجہ نہ تھا، ہر وہ تہذیب جس کی عمارت حدُود اللہ کی بُنیادوں پر استوار نہ ہو، اس میں غیرت اور حمیّت، جہلا کا حصّہ سمجھی جاتی ہے۔ اِس میں مرد اور عورت دونوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ، بقول اکبرؔ

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذّب ہیں
حیا اُن کو نہیں آتی، اِنہیں غُصّہ نہیں آتا!

حقیقت یہ ہے کہ غیرت، ضبطِ نفس سے پیدا ہوتی ہے اور "تہذیب" کی حکمرانی میں خدا سے انکار کیا ہی اِس لیے جاتا ہے کہ نفس کی کامرانیوں میں کوئی روک ٹوک نہ رہے۔

عورتوں کی محفل

اِس کے بعد قرآن نے، اِس قصّہ کی اگلی کڑی یوں بیان کی ہے:

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۡ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾

"جب اس واقعہ کا چرچا ہُوا تو شہر کی عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ اُنھوں نے کہا کہ عزیز کی

کی بیوی نے اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے شروع کیے ہیں، وہ اُس کی محبت میں دیوانی ہو رہی ہے، لیکن اس کے لیے اُس نے جو طریقہ اختیار کیا وہ غلط تھا (اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کا مقصد حاصل نہ ہُوا، غلام بری الذمّہ قرار پاگیا اور وہ مجرم قرار پاگئی۔ اسے یُوں نہیں، یُوں کرنا چاہیئے تھا۔ جس سے یا تو مقصد براری ہو جاتی یا غلام، مجرم قرار پاجاتا)۔ (۳۰)

جب عزیز کی بیوی نے اُن کی تدبیر سُنی (تو اُس نے کہا، اسے بھی آزما دیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ) اُس نے انہیں (رازدارانہ طریق سے) کھانے پر بُلایا۔ اُن کے لیے مسندیں بچھا دی گئیں اور چھُریاں (چمچے وغیرہ) سامنے رکھ دیے گئے۔ پھر اُس نے یُوسف کو بلایا۔ (چُنانچہ اُنھوں نے وہ سب کچھ کر کے دیکھا جس کے لیے اِس قدر اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن اُن کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اِس پر وہ یُوسفؑ کی پختگیٔ سیرت کی قائل ہوگئیں)۔ اور کہنے لگیں کہ سُبحان اللہ! یہ انسان نہیں، واقعی کوئی واجبُ التکریم فرشتہ ہے۔ (اب وہ اپنی تدبیر کے دُوسرے حصّے کی طرف آئیں۔ کہ اگر مقصد براری نہ ہو سکے تو یُوسفؑ مجرم قرار پاجائے۔ اس کے لیے اُنھوں نے) اپنے ہاتھ زخمی کر لیے۔ (یہ اُن کی بہت بڑی چال تھی۔ (۱۲/۵۰))"(۳۱)

ضمناً، قرآن کریم نے یہاں "قطعِ ید" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اِس کے یہ معنی نہیں کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر کلائیوں سے الگ کر دیے تھے۔ اِس سے مُراد یا تو محض ہاتھ روک لینے کے ہیں اور یا ہاتھوں کو زخمی کر لینے کے۔ قرآن کریم نے چور کی سزا کے سلسلہ میں جو "قطعِ ید" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اُن کا مطلب یہاں سے واضح ہو جاتا ہے۔ (دیکھئے مطالبُ الفرقان۔ جلد چہارم۔ ص ۵۰۳)

ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اِس مجلس میں جو کچھ ہُوا، اِسے حضرت یُوسفؑ نے ان عورتوں کا کَیْد (مکر، خُفیہ سازش) کہہ کر پُکارا ہے (دیکھئے ۱۲/۳۳؛ ۱۲/۵۰) اور اپنے ربّ سے دُعا کی ہے کہ مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ ان کے حربوں کا مقابلہ کر سکُوں (۱۲/۳۳)۔ اس سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ خُود وہ عورتیں بھی حضرت یُوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اِس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب بادشاہ نے اس معاملہ کی تحقیق کی تو اس نے ان عورتوں سے (یعنی اکیلی عزیز کی بیوی سے نہیں بلکہ دوسری عورتوں سے بھی) کہا تھا:

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْۗءٍ ۭ (۱۲/۵۱)

"(چنانچہ بادشاہ نے اس مقدمہ کی خود تحقیق کی) اور ان عورتوں سے کہا کہ سچ سچ بتاؤ کہ جب تم نے یوسفؑ کو

اُس کے ارادے سے پھیرنا چاہا تھا، تو اُس وقت کیا بات پیش آئی تھی ؟ اُنھوں نے کہا حاشَ للہ ! ہم نے یوسفؑ میں کوئی بُرائی کی بات نہیں دیکھی تھی۔ (وہ بالکل بے گناہ تھا)۔ ۱۲/۵۱"

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ تنہا عزیز کی بیوی نے نہیں بلکہ سوسائٹی کی اور عورتوں نے بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا۔ لہٰذا، ہو سکتا ہے کہ اس محفل میں اُن کا مبہوت ہو کر اپنے ہاتھ زخمی کر لینا اور حُسنِ یوسفؑ کی اس قدر تعریف کرنا، ان کی " ایکٹنگ " ہی ہو جس سے مقصود خود اپنی محبت کا اظہار ہو۔ اِس لیے کہ نفسیاتی طور پر یہ حربہ بڑا مؤثر ہوتا ہے کہ کسی کے حُسن کی اِس طرح والہانہ تعریف کی جائے اور اُسے باور کرایا جائے کہ اُسے دیکھ کر بڑے سے بڑے بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔



اِس کے بعد :

۱۲/۳۲ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ

" (عزیز کی بیوی نے اپنی سہیلیوں سے کہا کہ کیوں ؟ تم نے بھی آزما کر دیکھ لیا ناں !) یہ ہے وہ " غُلام " جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں (کہ مجھ سے اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ ایک غلام کو رام کر لوں) میں نے اِسے اس کے اِرادے سے پھیرنے کے لیے سب کچھ کر دیکھا، لیکن اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہُوا۔"

جذبۂ انتقام

اِس کے بعد وہ عورت ضد پر آگئی۔ اور اس نے برملا کہہ دیا :

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

" اگر اب بھی اُس نے میرا کہنا نہ مانا تو اِسے ضرور قید کرا کر رہوں گی اور اسے ذلیل و خوار ہونا پڑے گا۔ (اس لیے کہ اب، تمہاری اس تدبیر کی وجہ سے، اِس کے خلاف جُرم ثابت کرنے کے لیے محکم ثبُوت موجود ہے کہ اُس نے تم پر بھی ہاتھ ڈال دیا تھا اور اس کی مدافعت میں تمھارے ہاتھ زخمی ہو گئے)۔"

ذرا اس تصوّر کو سامنے لائیے۔ دُنیا جہان میں قاعدہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس لیے حوالۂ قید و بند کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابُو نہ رکھ سکے اور اُنھوں نے کسی کی عصمت پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہاں مُعاملہ مُختلف ہے۔ حضرت یُوسفؑ کو اس لیے قید کی دھمکی دی جا رہی ہے کہ اُنھوں نے اپنے جذبات پر قابو کیوں رکھا ! یہ ایک نئی آزمائش تھی۔ محل کی آرام کی زندگی،

عزّت و وقار۔ دولت وحشمت اور اس کے مقابلہ میں جیل خانہ کی عقوبت! حضرت یوسفؑ کو اختیار حاصل تھا کہ ان دونوں میں سے جسے چاہیں پسند کریں۔ انہوں نے ایقان و ایمان کی پوری قوّت سے بلا تأمل کہہ دیا:

۱۲/۳۳ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾

"(یوسفؑ اب اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ ان عورتوں کے ارادے کیا ہیں۔ چنانچہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ قید وبند کی مصیبتیں برداشت کرے گا لیکن اپنی سیرت وکردار کو داغدار نہیں ہونے دیگا)۔ اُس نے اپنے نشوونما دینے والے سے کہا کہ جس بات کی طرف مجھے یہ بلاتی ہیں' اس کے مقابلہ میں مجھے جیل جانا زیادہ پسند ہے۔ بارالٰہا! تو میری مدد کر اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں ثابت قدم رہوں۔ اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہُوا اور میں ان کے فریب میں آکر اُن کی طرف مائل ہو گیا تو یہ بڑی حق ناشناسی ہوگی۔"

عورتوں کی نگاہوں میں حضرت یوسفؑ کا حُسنِ صورت ہی تھا، لیکن دیکھنے والی آنکھ کے لیے اُن کے حُسنِ سیرت کی جمال آفرینی حُسنِ صورت سے کہیں بڑھ کر تھی۔

یہاں پھر دیکھئے۔ حضرت یوسفؑ نے یہی کہا ہے کہ "مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ" جس بات کی طرف مجھے یہ عورتیں بُلا رہی ہیں، اُس سے قید خانہ کہیں اچھا ہے۔ اس سے بھی اس توجیہہ کی تائید ہوتی ہے جسے ہم مجلسِ ضیافت والے واقعہ میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی اس مجلس کے تمام اہتمامات اس غرض کے لیے تھے کہ وہ عورتیں حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرلیں اور اس مقصد کے حصُول کے لیے اُنھوں نے طرح طرح کے مکر و فریب سے کام لیا تھا۔ انہی میں سے ایک ہاتھ کاٹنے کا تریا چلتّر بھی تھا۔

اِدھر سے، خدا کے اس مخلص بندے نے اپنے ربّ کو مدد کے لیے پکارا اور اُدھر سے اُس کے ربّ نے بابِ اجابت وا فرما دیا:

۱۲/۳۴ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۴﴾

"سو اُس کے پروردگار نے اُس کی دعا کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا۔ چنانچہ اُن کا جادو نہ چل سکا اور وہ اسے اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہیں۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔"

بلاجُرم قید و بند

جب عزیزِ مصر کی بیوی نے دیکھا کہ دھمکی سے بھی کام نہ چلا تو اُس نے دھمکی کو سچ کر دکھانے کا سوچا اور اپنی ہمراز عورتوں کے صلاح و مشورے سے کچھ ایسی بات بنائی کہ عزیز اور اُس کے متعلقین کو اِسی میں مصلحت نظر آئی کہ حضرت یوسفؑ کو کچھ وقت کے لیے پابندِ سلاسل کر دیا جائے :

۱۲/۳۵ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

" (یوں ناکام رہنے کے بعد، اِن عورتوں نے یوسفؑ کے خلاف جھوٹا مقدمہ کھڑا کر دیا)۔ ججوں نے مختلف قرائن سے دیکھ لیا کہ یوسفؑ بے گناہ ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اِسی میں مصلحت سمجھی کہ یُوسفؑ کو کچھ مُدّت کے لیے قید کی سزا دے دی جائے۔ (اِس قسم کے معاشرہ میں "اعلیٰ طبقہ" کی مصلحتیں کچھ ایسی ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یوسفؑ کو داخلِ زنداں کر دیا گیا)۔"

آگے بڑھنے سے پہلے، راستہ کے اِس گوشہ پر ایک مرتبہ پھر نگہِ بازگشت ڈال لیے۔ عزیزِ مصر دیکھ چکا تھا کہ اُس کی بیوی حضرت یوسفؑ کی طرف کس طرح مائل ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو وہ حضرت یوسفؑ کو محلّات سے الگ کر سکا (اسلیے کہ اس کی بیوی کبھی ایسا نہ ہونے دیتی) اور نہ ہی اپنی بیوی کو اُس کے مذموم ارادوں سے روک سکا۔ یہ سب اِس لیے کہ اِس قسم کی مصنوعی تہذیب میں عورت کے مقابلہ میں مرد بیچارے کی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ اور یہ حالت اکیلے عزیز ہی کی نہ تھی، دیگر امراء و اراکین بھی ایسے ہی تھے اس لیے کہ ان کی عورتوں کی کیفیت بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے۔ یعنی اس سوسائٹی کی عام معاشرتی حالت ہی ایسی ہو چکی تھی۔ پھر دیکھیے کہ ایک ناکام محبت عورت اپنے جذبۂ انتقام میں کیا کچھ کرتی ہے؟ اور تیسرے یہ کہ مرد کس طرح عورتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ عزیز اور اس کے گھرانے کے لوگ حضرت یوسفؑ کی راست بازی اور عصمتِ نفس کی نشانیاں دیکھ چکے تھے، وہ جانتے تھے کہ قصور کس کا ہے۔ لیکن بایں ہمہ مجبور ہو گئے کہ امراۃ العزیز نے جو دھمکی دی تھی اُسے پُورا کر دیا جائے۔ خُدا فراموش سوسائٹی میں حق و انصاف کی اِسی طرح مٹی پلید ہُوا کرتی ہے۔

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ اِس سورۃ میں حضرت یوسفؑ کی عظمتِ سیرت کے مختلف گوشوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس وقت تک اس میں ایک گوشہ نمایاں طور پر ہمارے سامنے آیا ہے۔ یعنی حفاظتِ عصمت — اِس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، حفاظتِ عصمت کس قدر گراں بہا قدر ہے۔ قرآن کریم نے حضرت یوسفؑ کے علاوہ ایک اور ہستی کی انفرادی زندگی کا تفصیلی تذکرہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ ہیں حضرت مریم (علیہا السّلام)۔ مطالبُ الفرقان کی سابقہ جلدوں میں یہ تذکرہ محفوظ ہو چکا ہے (دیکھیے۔ بالخصوص جلد چہارم۔ صہ۱۔ تا آخر)۔ وہ نبی تو نہیں لیکن اُن کے لیے بھی

اصْطَفٰكِ (برگزیدگی) کا لفظ انبیاء کرامؑ کی طرح آیا ہے (۳/۴۲) ان کی اس بلندیٔ مرتبت کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ — اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۲۱/۹۱) اُنہوں نے اپنے دامنِ عصمت کو داغدار نہ ہونے دیا۔ (اور اسی خصوصیت کی بنا پر اُن کے اُسوہ کو دُنیا جہان کی عورتوں کے لیے مثالی قرار دیا۔ (۶۶/۱۲)

حیوانی سطح پر جنسی اختلاط کا تعلق عملِ افزائش نسل سے ہے۔ لیکن انسانی سطح پر اس کا مقام کچھ اور ہے۔ اس کے متعلق ہم نے مطالبُ الفرقان جلد اوّل (ص۲۳۴ پر) لکھا تھا کہ اور تو اور خود مغرب کے محققین بھی اپنی مدت العمر کی تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قوموں کے عروج و زوال کا اس کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہم نے وہاں کہا تھا کہ اس کے متعلق مناسب مقام پر تفصیل سے لکھیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مقام اس تشریح کے لیے مناسب ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J.D. UNWIN) نے اس سوال کو اپنی تحقیقات کا موضوع قرار دیا کہ جنسی جذبہ کی تسکین محض ایک انفرادی فعل ہے جس کا تعلق دو افراد سے ہوتا ہے یا اس کا کوئی اثر اس قوم کی تہذیب و تمدن پر بھی پڑتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اُس نے دُنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے اَسّی غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ کیا، اور پھر سولہ مہذب اقوام کی معاشرتی زندگی کا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی تحقیق کے نتائج کو اپنی گراں قدر تصنیف (SEX AND CULTURE) میں پیش کیا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر انون اس وقت حیات ہیں یا وفات پا چکے ہیں، لیکن ان کی زندۂ جاوید کتاب ہمارے سامنے ہے جس کے ضروری اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

> "دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل، سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط نتائج اِس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں"

متنِ کتاب سے بھی پہلے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

> اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک اُن لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو اُن حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اُس گروہ نے جنسی تعلقات پر عاید کر رکھی ہوں۔ (x/v)

اس کلیہ کو اس نے متنِ کتاب میں ان الفاظ میں لکھا ہے کہ:

> کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اُس

نے ماضی اور حال میں جنسی تعلّقات کے لیے کس قسم کے ضوابط مرتّب کر رکھے تھے۔ (صفحہ ۳۲)
آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلّقات محض ایک جبلّی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدّن کا دار و مدار اس جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ہے کہ:

"اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدّنی سطح بلند ہوگئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلّقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس تمدّنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔" (صفحہ ۳۰)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:

"جنسی تعلّقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔"
(صفحہ ۳۳)

اس لیے اگر کسی قوم میں تمدّنی تبدیلی واقع ہو، یعنی اُسے دنیا میں تمدّنی عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آجائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لیے دیکھنا چاہیئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے جنسی تعلّقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں۔ جیسی وہ تبدیلیاں ہوں گی، اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

جبری تجرّد

سب سے پہلے تجرّد کی زندگی (CELIBACY) کو لیجئے، جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلکِ خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لیے اوّلین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ:

"جبری تجرّد (COMPULSORY CELIBACY) کے اثرات انسانی تمدّن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔"
(صفحہ ۸۴)

جبری تجرّد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقاید یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرّد کی زندگی وجہِ شرف و تقدّس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرّد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (NUNS) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسلکِ خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرّد کی زندگی ہی وجہِ شرفِ انسانیت ہے تو دوسری طرف آج کل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عائد

کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ڈاکٹر انوین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں، بلکہ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ صفحہ XII)

آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ:

"جو قومیں اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دیں کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلاقیود جنسی جذبات کی تسکین کرلیا کرتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہُوا کہ اُن کے پاس کسی اور کام کے لیے توانائی ہی نہ رہی۔" (صفحہ ۳۹۸)

ڈاکٹر فرائڈ (ہمارے دور کا علم النفس کا ممتاز محقق) اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ:

"جب جنسی جذبات پر کچھ پابندیاں عائد کردی جائیں تو یہ اپنا رُخ دوسری طرف منتقل کرلیتے ہیں جسے (SUBLIMATION) کہتے ہیں) اور اس لیے افراد کی فالتو توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر اُن گوشوں کی طرف منتقل ہوجاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔"

(INTRODUCTORY LECTURES ON PSYCHO-ANALYSIS
TRANSLATED BY J. RIVIERE P. 17)

اس کے برعکس، جو قوم جنسی جذبات کی تسکین کو بے محابا چھوڑ دیتی ہے اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انوین کہتا ہے کہ:

"اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی[1] وہ واقعات کے اسباب و علل (CAUSES) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہ اُسے اُسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مُطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو اُن کی سمجھ میں نہ آئے، کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کردیتے ہیں۔ اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے

---

[1] دیکھیئے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ (۱۷۹/۷)

حیوانات کو جو انہیں محیرّ العقول نظر آئیں، اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت اُن کی سمجھ میں نہ آئے، جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے، وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اُس کی موت کے بعد بھی اُسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ (اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان تمام توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز، گنڈہ، تعویذ، اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے) اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد اُن پر کسی طرح اثرانداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں، اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مرجاتے ہیں اور ان کی لاشوں کو تہِ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہوجاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے بلکہ حیوان ہوتے ہیں[1]۔ (صفحہ ۳۴۶-۳۴۵)

یہ ایک غیر مسلم مغربی محقق کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اِس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جنسی جذبہ کی تسکین کا قوم کی موت و حیات سے کس قدر گہرا تعلق ہے اور قرآنِ حکیم نے اس پر جو اس قدر پابندیاں عائد کی ہیں اُن کی غرض و غایت کیا ہے؟ ہمارے ہاں کا نوجوان طبقہ (اقوامِ مغرب کی تقلید میں) عام طور پر کہہ دیا کرتا ہے کہ جنسی جذبہ کی تسکین فطرت کا تقاضا ہے، اِسے جس طرح بھی پورا کر لیا جائے، ٹھیک ہے۔ اس پر پابندیاں معاشرتی تقاضے ہیں معاشرہ مناسب سمجھے تو انہیں نرم کر دے، یا سرے سے ختم ہی کر دے۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے ـــ اعتراض وہ ہو سکتا ہے جسے خود اقوامِ مغرب کے ایک محقق نے اپنی مدّت العمر کی تحقیق کے بعد عائد کیا ہے۔ ان پابندیوں کا تعلق قوم کے عروج و زوال سے ہے۔ اِسی سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآنِ کریم نے داستانِ حضرت یوسفؑ میں اس واقعہ کو اس قدر اہمیت کیوں دی ہے اور اسے ہمارے لیے کیوں موجبِ عبرت و موعظت قرار دیا ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ محلّات کے نظم و نسق کا کارفرما اور (فی الجملہ) وہاں کی آرام و آسائش کی زندگی کا خوگر، یوسفؑ اب قید خانے کی مصیبتیں جھیل رہا ہے۔ اور اس جرم میں کہ اُس نے جذبات کو مشتعل کر دینے والے اسبابؑ مواقع میں بلند اخلاقی قدر کی، جو خدا کی طرف سے متعین ہوئی تھی، پابندی کیوں کی! حضرت یوسفؑ کی پاکبازیؑ شرافتِ نفس اور نیکوکاری کچھ ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ اسی جگہ گزارا تھا جہاں اُنہیں اب قید میں ڈالا گیا تھا۔ اِس لیے قید خانہ میں بھی ان کا احترام اور تقدّس مسلّم تھا۔ جیل میں آپ کے ساتھ دو اور

---

[1] یہ بھی قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ۔ (۴۷/۱۲) وہ سامانِ زیست سے اس طرح کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان۔

نوجوان بھی تھے۔ ایک بادشاہ کے ساقیوں کا سردار اور دُوسرا داروغۂ مطبخ۔ یہ کسی مُعاملہ میں زیرِ عتاب آگئے اور

قید خانہ کے ساتھیوں کے خواب

قید خانہ میں ڈال دیئے گئے۔ اُنھوں نے ایک رات خواب دیکھے اور چونکہ حضرت یُوسفؑ کی فراست اور بزرگی پہلے سے معروف تھی، وہ اُن کے پاس گئے کہ اپنے خوابوں کی تعبیر دریافت کریں۔

(۱۲/۳۶) وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۶

یُوسفؑ کے ساتھ دو اور نوجوان بھی جیل خانہ میں آئے۔ (ایک دن) اُن میں سے ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اُٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے انہیں (نوچ نوچ کر) کھا رہے ہیں۔ ہمیں بتاؤ کہ ان کا مطلب اور تأویل کیا ہے، کیونکہ تم بڑے سمجھدار اور نیک آدمی دکھائی دیتے ہو۔

قید خانہ میں حضرت یوسفؑ جو کچھ ان قیدیوں کے متعلق دیکھ اور سُن رہے تھے، اُس سے اُن کے خوابوں کی تعبیر کا اندازہ لگانا چنداں مُشکل نہ تھا۔ اس لیے آپؑ نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ وہ نوجوان اپنی ضرورت کی غرض سے آپ کی طرف خاص طور پر متوجہ تھے۔ آپؑ نے سوچا کہ دینِ حقیقی کے متعلق ایک اصُولی بات اُن کے کان میں ڈال دی جائے، ممکن ہے وہ اُسے بادشاہ تک پہنچا دیں۔ لیکن انہوں نے ان نوجوانوں کو نفسیاتی طور پر مزید متاثر کرنے کے لیے انھیں تھوڑا سا انتظار میں رکھنا ضروری سمجھا:

(۱۲/۳۷-۳۸) قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۷ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَاۗءِيْٓ

اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

(ایک مبلّغ پیغاماتِ خداوندی کی طرح، جو اس مقصد کے لیے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، یوسفؑ نے سوچا کہ یہ نوجوان، اِس وقت اُس کی بات سُننے کے لیے ہمہ تن گوش ہیں، لہٰذا، اِن کے کان میں توحید کی آواز ڈال دینی چاہیئے)۔ چنانچہ اُس نے اُن سے کہا کہ میں تمہارے کھانے کے وقت سے پہلے تمہارے خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ (لیکن پہلے، یہ تو سُن لو کہ میں کون ہوں اور میرا پیغام کیا ہے)۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا، بلکہ اُس علم کی بنا پر کہتا ہوں جو مجھے میرے پروردگار کی طرف سے ملا ہے۔

سب سے پہلے یہ سُن لو کہ میں اُن لوگوں کے مسلک پر نہیں ہوں جو نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

(تم نے ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ کا نام تو سُنا ہوگا)۔ میں انہی کی اولاد میں سے ہوں اور انہی کے مسلک کا پیرو ہوں۔ ہم اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے۔ اس حقیقت کا پا لینا (کہ اقتدارِ خداوندی میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہیئے) خدا کا بہت بڑا فضل ہے جو اس نے ہم پر اور دوسرے انسانوں پر (جو اس مسلک کے متبع ہیں) کیا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اُس کے اِس فضلِ عظیم کی قدرشناسی نہیں کرتے۔

وعظِ یوسفی اپنے کیش و مشرب کا یوں تعارف کرانے کے بعد اب مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ کی تشریح ارشاد فرمائی اور اس میں دینِ خداوندی کی اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کر دیا جو اسلام کا اصل الاصول ہے۔ فرمایا:

(۱۲ — ۳۹—۴۰) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ؕ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

(توحید کے اس نکتہ کو میں تمہیں ایک اور انداز سے سمجھاتا ہوں) ایک شخص صرف ایک آقا کا نوکر ہے۔ اور وہ آقا بھی ایسا ہے جو ہر قسم کے اختیارات رکھتا ہے۔ اور دُوسرا شخص بیک وقت متعدد مالکوں کی نوکری کرتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اُن میں سے کس کی زندگی اچھی طرح سے گزرے گی؟ ظاہر ہے کہ اس کی زندگی اچھی ہوگی جو ایک آقا کا ملازم ہے اور وہ اس کی تمام ضروریات پوری کرتا رہتا ہے۔

بس یہی صُورت ایک خُدا کی اطاعت اختیار کرنے والوں کی اور ان کے مقابلے میں، اُن کی ہے جو مختلف آقاؤں کو اپنا خُدا مانیں۔ تم لوگ مختلف خداؤں کے سامنے جُھکتے ہو۔ کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان خداؤں کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے؟ بس اتنی ہی کہ یہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔ ورنہ اُن کی اپنی کوئی حقیقت اور پوزیشن نہیں۔ (تم سے کہا جاتا ہے کہ یہ خُدا کے نمائندے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے) خُدا نے اُن کے لیے کوئی سند نہیں بھیجی (کہ اُس نے انہیں اپنے اختیارات دے رکھے ہیں)۔ یاد رکھو! اختیارات و اقتدارات کا واحد مالک خُدا ہے۔ اس کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اُس کا فرمان یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اور اطاعت اختیار نہ کی جائے۔ یہ ہے زندگی کا محکم اور استوار نقشہ۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے؛

اِسلام کیا ہے؟ — وعظِ یوسفی کے اِن مختصر سے جُملوں کی عملی تفسیر۔ یُوں کہیے کہ سارا قُرآن اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہجہان کو جب قلعۂ آگرہ میں قید کر دیا گیا تو اُس نے ایک نادرہ کار صنّاع سے کہا کہ اس کے کمرے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا نگینہ اس انداز سے ٹکا دے کہ وہ کمرے کے اندر جہاں بھی ہو، اُٹھتے بیٹھتے پُورے کا پُورا "تاج" اس کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ وعظِ یُوسفی کے اِن چھوٹے چھوٹے نگینوں کو دیکھئے، ایک ایک نگینہ میں پُورے کا پُورا "تاج" کس طرح جھلمل جھلمل کرتا نظر آرہا ہے —! ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ توحید کی پُوری کائنات اس نگینہ کے اندر سمائی ہُوئی ہے۔ انسان اُسی کے سامنے جُھکتا ہے جس میں (بزعمِ خویش) شانِ ربوبیت سمجھتا ہے۔ جس کے متعلق اُسے خیال ہوتا ہے کہ مجھے کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے (یا نقصان دے سکتا ہے)۔ ذرا سوچئے کہ خُدا تراشی کے اس مسلک میں اُسے دُنیا میں کس کس کے سامنے جُھکنا پڑتا ہے اور وہ کن کن چوکھٹوں کی ذِلّت آمیز خاک سے اپنی پیشانی

کو داغدار کرتا ہے۔

گاہ اُورا باکلیسا سازباز　　گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز
دینِ اُو آئینِ اوسوداگری است　　عنتری اندر لباسِ حیدری است　　(اقبالؔ)

مثل مشہور ہے کہ ایک شخص بیک وقت دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ اس سے اُس "عملی مشرک" کی کیفیت کا اندازہ لگائیے جسے اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنے نئے آقا کے سنگِ آستاں پر جبیں سائی کرنی پڑے اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اُن میں سے کسی میں بھی وہ قوت نہ ہو جس کے احساس سے وہ ان کے سامنے جھکتا ہے مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ سو جب کسی انسان میں ربوبیّت کی قدرت ہی نہیں تو ایک انسان کسی دوسرے انسان کی محکومیت کیوں اختیار کرے؟ حکومت صرف اُس ذات کو زیبا ہے جس کے قانون کے مطابق نفع و نقصان کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اِس لیے سُن رکھو کہ (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ) اس کا حکم ہے کہ اس کے قانون کے سوا اور کسی قانون کی اطاعت نہ کرو۔ یہ ہے (دینِ قیّم) محکم نظام جس کے تابع انسان کو چلنا چاہیئے۔ سابقہ جلدوں میں شرک اور توحید، خُدا کی حکومت، عبدیّت، اسلامی مملکت، قرآنی نظامِ حکومت کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ انڈکس کی مدد سے ان مقامات کو سامنے لائیے۔ وعظِ یوسفی کی تشریحات پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ ریز ہو جائیں گی۔

۱۲/۴۱ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱

(اس تبلیغ کے بعد، یوسفؑ نے ان سے کہا کہ اب سنو اپنے خوابوں کی تعبیر)۔ تم میں سے ایک (جس نے دیکھا ہے کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے) اپنے آقا کی ساقی گری کرے گا اور دُوسرا سُولی پر چڑھا دیا جائے گا جہاں سے پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ تم نے جن خوابوں کے متعلق مجھ سے پوچھا ہے اُن کی تعبیر یہ ہے۔ تعبیر کیا؟ بس یوں سمجھو کہ یہ قطعی فیصلہ ہے (میرا اندازہ یہی ہے)۔

جس کے متعلق سمجھا تھا کہ وہ مصائب سے نجات پا جائے گا، حضرت یُوسفؑ نے اُس سے کہا کہ سو قع پاکر

بادشاہ سے ان امور کا تذکرہ کر دینا جو میں نے تم سے کہے ہیں، یعنی توحید باری تعالیٰ اور حکومت خداوندی سے متعلق۔ لیکن ان باتوں کا اثر اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب بادشاہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ قیدی بے گناہ ہے ورنہ ایک مجرم قیدی کے پند و نصائح پر کون کان دھرتا ہے۔ اس لیے یہ بھی کہا ہو گا کہ بادشاہ سے میری قید کی حقیقت بھی کہہ دینا۔ وہ دونوں نوجوان قید سے نکال لیے گئے اور حضرت یوسفؑ کی بیان کردہ تعبیر کے مطابق ہی ان کے ساتھ سلوک ہوا لیکن وہ نوجوان جو اپنے منصب پر بحال ہو گیا تھا حضرت یوسفؑ کی بات بھول گیا اور یوں

وَقَالَ لِلَّذِىْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِىْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِى السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

ان میں سے جس کے متعلق یوسفؑ کا اندازہ یہ تھا کہ وہ چھوٹ جائے گا، اس سے یوسفؑ نے کہا کہ تم جب اپنے آقا کے پاس جاؤ تو اس سے ان باتوں کا ذکر ضرور کرنا جو میں نے تم سے کی ہیں۔

چنانچہ وہ قید سے رہا ہو گیا لیکن شیطان نے اُسے بھلا دیا کہ وہ ان باتوں کا ذکر اپنے آقا سے کرے۔

اس بات کو کئی برس ہو گئے اور یوسفؑ قید میں پڑا رہا۔

بادشاہ کا خواب

وقت گزرتا گیا حتیٰ کہ ایک رات بادشاہ نے عجیب و غریب خواب دیکھا جس کی تعبیر بتانے سے دربار کے اہلِ دانش عاجز رہ گئے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّىْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِىْ فِىْ رُءْيَاىَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

ایک رات بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دُبلی گائیں نگل رہی ہیں اور سات خوشے ہرے ہیں اور (سات) سُوکھے ہوئے۔

اُس نے اپنے درباریوں سے اپنا خواب بیان کیا اور ان سے کہا کہ اگر تم خوابوں کی تعبیر بتا سکتے ہو تو بتاؤ میرے

خواب کی تعبیر کیا ہے؟

اُنہوں نے کہا کہ یہ خواب نہیں، محض پریشان خیالی ہے۔ اور اس قسم کی پریشان خیالیوں کی تعبیر ہم نہیں جانتے۔

اہلِ دربار میں جب اس کا چرچا ہُوا تو ساقیوں کے سردار کو اپنا قید خانہ کا خواب اور حضرت یوسفؑ کی بتائی ہُوئی تعبیر اور تعبیر کی صداقت یاد آگئی۔

۱۲/۴۵ وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿۴۵﴾

اُن دو قیدیوں میں سے جس نے رہائی پائی تھی، اُسے (اس خواب کے سلسلہ میں) مدّت کے بعد یوسفؑ کی یاد آگئی۔

اُس نے کہا کہ مجھے (قید خانے میں) جانے دو۔ میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتا دوں گا۔

چنانچہ وہ بھاگا بھاگا حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا:

۱۲/۴۶ يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۴۶﴾

وہ قید خانہ میں آیا اور یوسفؑ سے کہا کہ اے سچی تعبیریں بتانے والے! ہمیں اس خواب کی تعبیر بتاؤ کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دُبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور (سات) خشک۔

میں اس کی تعبیر کو اُن لوگوں تک پہنچاؤں گا (جنہوں نے مجھے اس مقصد کے لیے یہاں بھیجا ہے) وہ اس سے تمہاری قدر و قیمت پہچان لیں گے؛

غور کیجئے یہ وہی نوجوان ہے جسے حضرت یوسفؑ نے اس کی رہائی کا مژدہ سنایا تھا اور تاکید کی تھی کہ وہ اس کا ذکر بادشاہ سے کرے۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ بادشاہ سے اس کا ذکر کرنا بھُول گیا بلکہ اظہارِ تشکّر کے لیے بھی اُن کے پاس نہ آیا اور اب جبکہ ایک غرض لاحق ہوئی، تو حضرت یوسفؑ یاد آئے۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو سب سے پہلے اس نوجوان سے ان تمام اُمور کا گلہ کرتا اور معاملہ کی اہمیّت کے پیشِ نظر اس سے کہتا کہ میں تمہیں اس کی تعبیر کیوں بتاؤں؟ بادشاہ کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے تو مجھے یہاں سے نکالے، میں خود جا کر بتاؤں گا لیکن

ایک عام انسان اور اللہ کے مخلص بندوں میں کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف کا یہی فرق ہوتا ہے۔ آپ نے نہ اُس سے کسی قسم کی شکایت کی اور نہ ہی اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ تعبیر بھی بتادی اور اس تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی۔

(۱۲ / ۴۷ — ۴۹) قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَ فِیْهِ یَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

یوسفؑ نے اس سے (ایک حرف شکایت کہے بغیر کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا) کہا (کہ میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بھی بتاتا ہوں اور وہ تدبیر بھی جس سے تمہارا ملک آنے والی تباہی سے بچ جائے گا۔ لو سُنو) تم لوگ سات سال تک خوب محنت سے کھیتی باڑی کرو۔ اور جب فصل کاٹو تو سوائے اتنے غلّے کے جو تمہارے کھانے کے کام آئے، باقی اناج، بالوں کے اندر ہی رہنے دو (تاکہ وہ کیڑوں سے محفوظ رہے)۔

اس کے بعد سات سال ایسے آئیں گے جو (قحط سالی کی وجہ سے) سخت مصیبت کے ہوں گے۔ اس قحط سالی کے زمانے میں وہ سارا غلّہ تمہارے کام آئے گا جسے تم نے ذخیرہ کر رکھا ہوگا۔ اس میں سے اتنا ضرور بچا رکھنا (جو بیج کے کام آئے)

کیونکہ اس کے بعد جو سال آئے گا اس میں عام بارش ہوگی (اناج بھی بافراط پیدا ہوگا اور انگور بھی) جس کا عرق لوگ نچوڑیں گے[1]

جب بادشاہ نے اس تعبیر اور اس کے ساتھ حسنِ تدبیر کو سنا تو اس پر حضرت یوسفؑ کی دانش و بینش اور فراست و تدبّر کے جوہر آشکارا ہو گئے اور اُس نے فوراً حکم دیا کہ اس شخص کو قید خانے سے رہا کر کے دربار میں لایا جائے۔

چنانچہ بادشاہ کا قاصد رہائی کا حکم لے کر حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا۔

اِس مقام پر سیرتِ یوسفیؑ کا ایک اور تابناک گوشہ وجہِ شادابیٔ قلب و نگاہ ہوتا ہے۔ جب تک قرآن کریم نہ بتائے، آپ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے کہ انہوں نے قاصد کو کیا جواب دیا ہوگا! اس لیے کہ اس کے بعد جواب

[1] خوابوں کی حقیقت کے متعلق سورۃ کے آخر میں گفتگو کی جائے گی۔

کیسا ؟ قیاس یہی کہتا ہے کہ آپ نے قید و بند کے مصائب سے نجات ملنے کو غنیمت سمجھا ہوگا اور فوراً اُس کے ساتھ دربار میں تشریف لے گئے ہوں گے۔ ہر شخص ایسے موقع پر یہی کچھ کرتا۔ لیکن جس کی خودی میں اتنی بیداری اور جس کے کیرکٹر میں اتنی بلندی پیدا ہو چکی ہو، وہ یہ نہیں کرے گا۔ اس سے الگ کچھ اور کرے گا۔ حضرت یوسفؑ نے کہا کہ بادشاہ کی توجہ فرمائی کا شکریہ۔ لیکن میں اس ترحّم خسروانہ کے صدقے قید خانہ سے نکلنا نہیں چاہتا۔ بادشاہ سے جا کر کہو کہ پہلے میرے مقدمہ کی تحقیق کرے اور جب ثابت ہو جائے کہ میں بے گناہ ہوں تو پھر میری رہائی کا حکم بھیجے۔ میرا مقصد قید و بند کے مصائب سے خلاصی حاصل کرنا نہیں، اپنی بریّت ثابت کرنا ہے۔

سیرتِ یوسفی کی ایک اور جھلک

۱۲/۵۰ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿۵۰﴾

(جب اُس شخص نے یہ تعبیر اور تدبیر بادشاہ تک پہنچائی تو وہ دنگ رہ گیا۔ اور) اُس نے کہا کہ اُس قیدی کو میرے پاس لاؤ (جس نے یہ تعبیر اور تدبیر بتائی ہے)۔ جب بادشاہ کا قاصد یوسفؑ کے پاس آیا (اور اُسے قید سے نکلنے کے لیے کہا۔ تو) یوسفؑ نے کہا (کہ میں اس طرح، ترحّم خسروانہ کی بنا پر قید سے نہیں نکلنا چاہتا) تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ (وہ پہلے میرے مقدمہ کی از سرِ نو تحقیقات کرائے تاکہ) یہ واضح ہو جائے کہ عورتوں کے ہاتھ کاٹ لینے کا ماجرا کیا تھا اور وہ کتنا بڑا فریب تھا جو مجھے پھنسانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ اس وقت تو اس حقیقت کا علم صرف میرے خدا کو ہے (لیکن مقدمہ کی تحقیق کے بعد اس کا علم عام ہو جائے گا کہ قصور کس کا تھا۔ اگر میں اس طرح بے گناہ ثابت ہو گیا تو پھر قید خانے سے باہر آؤں گا۔)

اللہ اکبر! کتنی بلند سیرت کا مظاہرہ ہے۔ لیکن تورات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ وہاں یہی مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے لباس تبدیل کیا اور فوراً دربار میں چلے گئے۔

تورات کا بیان

تب فرعون نے یوسفؑ کو بلوایا۔ وہ جلد اُسے قید خانے سے لے آئے اور اُس نے سر منڈایا اور کپڑے بدل کے فرعون کے حضور آیا۔ (پیدائش ۱۴/۴۱)

ہمارے ہاں کی ایک روایت

یہاں پہنچ کر ہمیں اپنے ہاں کی بھی ایک روایت یاد آگئی۔ تورات کے متعلق تو ہمارا یقین ہے کہ وہ محرّف ہے لیکن مقامِ تأسف ہے کہ ہماری ان کتابوں میں جنھیں "اصح الکتب" کہا جاتا ہے، اس سے بھی کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ بخاری میں ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جیسے بادشاہ کا قاصد آیا تھا، اگر میں حضرت یوسفؑ کی جگہ ہوتا تو فوراً اس کے ساتھ چلا جاتا۔

لو لبثت فی السّجن ما لبث یوسف لاجبت الدّاعی۔

اگر میں قیدخانہ میں اتنے عرصہ تک رہا ہوتا جتنے عرصہ تک یوسفؑ رہے تھے تو میں قاصد کے ساتھ ہولیتا۔

صاف نظر آتا ہے کہ اس قسم کی روایتیں معاندینِ اسلام (یہود و نصاریٰ) کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہیں جو انبیاء بنی اسرائیل کے مقابلہ میں حضورؐ کی سیرتِ اقدس کو گھٹا کر پیش کرنا چاہتے تھے[1] لیکن گلہ ان پر نہیں، اپنوں پر ہے کہ یہ اس قسم کی روایتوں کو سینہ سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور اگر حضورؐ کی عظمت و تقدّس کا خیال کسی کو اس امر پر مجبور کر دے کہ وہ ان روایات کو حضورؐ کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہ کرے تو اس کی تکفیر و تفسیق کے فتاویٰ صادر کر دیئے جاتے ہیں، اور یہ سب کچھ اس لیے کہ یہ روایتیں بخاری اور مسلم کی کتابوں میں درج ہیں۔ یعنی حضورؐ کی شانِ اقدس میں (معاذ اللہ) طعن پایا جائے تو مضائقہ نہیں، لیکن بخاری اور مسلم میں غلط روایات کے امکان کا خیال نہ پیدا ہونے پائے۔ بایں ہمہ، حقیقت بیں نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ غلطی سے مبرّا اس آسمان کے نیچے کتابُ اللہ کے سوا کچھ نہیں۔

وَذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰)

مُعاملہ کی تحقیق

فرعون، حضرت یوسفؑ کی دانش و بینش کا تو پہلے ہی معترف ہو چکا تھا، جب آپ کا یہ جواب سُنا تو آپ کی بلندیٔ سیرت کا احترام بھی اُس کے دل میں اُتر گیا۔ اُس نے فوراً تحقیقات کا حکم دے دیا اور اُن عورتوں سے دریافت کیا کہ بتاؤ اصل مُعاملہ کیا ہے۔

۱۲/۵۱ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ

---

[1] اس قسم کی ایک اور سازش کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد سوم (صفحہ ۹۶) دیکھئے جہاں بتایا گیا ہے کہ ان روایات کی رُو سے نمازوں کی تعداد کس طرح متعین ہوئی تھی اور پھر یہ روایات کہ حضورؐ ایک عرصہ بعید تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ (مطالبُ الفرقان جلد سوم۔ صفحہ ۸۳)

حَاشَ لِلّٰہِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْہِ مِنْ سُوْٓءٍ ط...

(چنانچہ بادشاہ نے اس مقدمہ کی خود تحقیق کی) اور ان عورتوں سے کہا کہ سچ سچ بتاؤ کہ جب تم نے یوسفؑ کو اُس کے ارادے سے پھیرنا چاہا، تو اُس وقت کیا بات پیش آئی تھی؟

اُنہوں نے کہا حاشا للہ! ہم نے یوسفؑ میں کوئی بُرائی کی بات نہیں دیکھی تھی۔ (یہ بالکل بے گناہ ہے)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان عورتوں نے بھی حضرت یُوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا اور مجلسِ ضیافت کی تمام حیلہ جوئیاں اور فریب کاریاں اسی غرض کے لیے تھیں اور اس کے بعد حضرت یوسفؑ کو قید خانہ میں بھجوانا بھی انہیں کے دامِ تزویر کی ایک کڑی تھی جو امراۃ العزیز کے ایما پر مرتب کی گئی تھی۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اِمرأۃ العزیز کا نام نہیں لیا۔ صرف ان عورتوں کیطرف اشارہ کیا (۱۲/۵۰) اس لیے کہ قمیص پھٹنے والے واقعہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عزیز نے حضرت یوُسفؑ سے کہا تھا کہ اس مُعاملہ کو رفت گزشت سمجھو۔ حضرت یوسفؑ کو ابھی تک اس بات کا خیال تھا اس لیے اپنے مربّی کی بات کا پاس کیا اور اُس کی بیوی کا نام لینا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب عورتوں کے مُعاملہ کی تحقیق ہُوئی تو سب کچھ بے نقاب ہو گیا۔ اس دوران میں عزیزِ مصر کی بیوی کے جذبات کی آندھیاں بھی اُتر چکی تھیں اور وہ حضرت یوُسفؑ کی بلندئ سیرت کی قائل ہو چکی تھی۔ لاکھ جذباتِ انتقام ہوں، سیرت کی بلندی اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جب دُوسری

حقیقت بے نقاب

عورتوں نے حضرت یوسفؑ کی پاکیزگئ داماں کی قسم کھائی تو اُس سے بھی نہ رہا گیا، اور اُس نے برملا کہہ دیا کہ ان کا مُعاملہ تو ایک طرف، خود میرے مُعاملہ میں بھی یوسفؑ کا کوئی قصوُر نہ تھا۔

(۱۲/۵۱) قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ز اَنَا رَاوَدْتُّہٗ عَنْ نَّفْسِہٖ وَاِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۵۱﴾

(یہ سُن کر عزیز کی بیوی بھی لب کشائی پر مجبور ہو گئی اور اس نے جُھکی ہوُئی نگاہوں اور لرزتے ہُوئے ہونٹوں کے ساتھ) کہا۔ اب جبکہ حقیقت اس طرح بے نقاب ہو گئی ہے تو مجھے اس کا اقرار کر لینا چاہیے کہ وہ میں ہی تھی جس نے یوسفؑ کو پھسلانا چاہا تھا۔ بے شک یوسفؑ اپنے بیان میں بالکل سچا ہے۔

اس پر حضرت یوسفؑ نے کہا:

۱۲/۵۲ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

(یوسفؑ نے کہا کہ میں نے اس مقدمہ کی از سرِ نو تحقیق پر اس لیے بھی زور دیا تھا کہ میرے مربّی اور مہربان) عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے، اس کی امانت میں خیانت نہیں کی تھی اور یہ کہ خدا کا قانونِ مکافات' خیانت کرنے والوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ (خیانت اس کی بیوی نے کی تھی۔ وہ خاسر و نامراد سامنے کھڑی ہے۔ میں امین تھا۔ آخر الامر کامیابی میرے ہی حصہ میں آئی)۔

تیرھواں پارہ شروع

پھر عزیزِ مصر کی بیوی نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

۱۲/۵۳ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

عزیز کی بیوی نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں اپنے بے گناہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی، میرے نفس نے مجھے بہکا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے حیوانی جذبات اُسے بُرائی کے لیے اُکساتے رہتے ہیں۔ اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔ وہی اس قسم کی لغزشوں سے محفوظ رکھنے والا اور مرحمت کرنیوالا ہے[1]؛

کون تھا جس کے دل میں سیرتِ یوسفی کی اس درخشندگی سے احترام و عظمت کے جذبات بیدار نہ ہو جاتے! دانش و بینش، تدبّر و فراست کے ساتھ، سیرت کی اتنی بلندی اور کیریکٹر کی اتنی پختگی۔ بادشاہ کی نگہ جوہر شناس نے فوراً اس کندن کو پہچان لیا۔

۱۲/۵۴ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

---

[1] نفسِ امّارہ، نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنہ کے متعلق دیکھیے مطالب الفرقان۔ جلد دوم، صـ ۵۷۔

بادشاہ نے (حقیقتِ حال سے باخبر ہونے کے بعد) کہا۔ یوسفؑ کو میرے پاس لاؤ۔ میں اُسے دوسروں سے ممتاز کرکے، خاص اپنے لیے مختص کرلینا چاہتا ہوں۔ (وہ میرا مشیرِ خاص ہوگا) چنانچہ جب بادشاہ نے یوسفؑ سے بات چیت کی (تو اس کے اور جوہر بھی اُس پر نمایاں ہوگئے)۔ اس نے کہا۔ آج سے تم ہماری نگاہوں میں بڑی عزّت و تمکین کے مالک قرار پاچکے ہو۔ تمہاری امانت اور دیانت مسلّم ہے۔

اللہ اکبر! کنعان کا چرواہا، بازارِ مصر میں نیلام شدہ غلام، برسوں کا قیدی اور بادشاہ کی طرف سے ان الفاظ کا مخاطب کہ:

إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ (۱۲/۵۴)

حضرت یوسفؑ نے سلطنت کے نظم و نسق کے مختلف شعبوں پر نگاہ ڈالی اور اندازہ لگالیا کہ کس شعبہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے سے باقی انتظامات صحیح رُخ اختیار کرلیں گے۔

۱۲/۵۵ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿۵۵﴾

یوسفؑ نے بادشاہ سے کہا کہ (مملکتِ مصر کی خوشحالی کا راز، اُس کی زمین کے خزانوں میں مضمر ہے) تم ان خزانوں (زمین کی پیداوار اور معاشی معاملات) کو میری تحویل میں دے دو۔ میں ان کی حفاظت کروں گا۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ کس طرح کیا جاتا ہے۔

غور کیجئے۔ جب حضرت یوسفؑ عزیز کے محلات میں پہنچے تھے اور وہاں کا نظم و نسق ان کی تحویل میں دے دیا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔

وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۱۲/۲۱)

جس شخص نے یوسفؑ کو خریدا تھا وہ (اُسے اپنے گھر لے آیا اور) اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ (اس لڑکے کے ساتھ عام غلاموں کا سا برتاؤ نہ کرنا بلکہ) اسے عزّت کے ساتھ رکھنا (کیونکہ اس کے چہرے بُشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اچھے گھرانے کا لڑکا ہے۔ اس لیے) ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارے لیے کسی فائدے کا موجب بن جائے۔ یا ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔

اِس طرح ہم نے سرزمینِ مصر میں یوسفؑ کے پاؤں جما دیے اور ایسا انتظام کر دیا کہ اس کی اچھی طرح سے تعلیم و تربیت ہو جائے اور اس میں معاملہ فہمی اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اللہ اپنی اسکیموں کو کامیاب بنا کر رہتا ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں (کہ ایسا کیوں اور کس طرح

ہو رہا ہے)۔

یعنی اس تمکّن سے غرض یہ تھی کہ حضرت یوسفؑ کے لیے مُعاملات فہمی اور حسنِ تدبیر کے مواقع بہم پہنچائے[1] جائیں۔ اس عملی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ آج حضرت یوسفؑ اتنے بڑے انتظام کو سنبھالنے کے قابل ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر فرمایا:

۱۲/۵۶ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۚ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾

اس طرح، ہم نے یوسفؑ کو، مملکتِ مصر میں، صاحبِ اختیار بنا دیا۔ ایسا صاحبِ اختیار کہ وہ اس کے نظم و نسق کو جس طرح چاہتا چلاتا۔ ہم اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق، لوگوں کو اپنی رحمت سے نوازتے ہیں۔

اور وہ قانونِ مشیّت یہ ہے کہ جو شخص حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے، ہم اس کی محنت ضائع نہیں کرتے۔ اُسے اُس کا اجر مل کر رہتا ہے۔

تَمَكَّنَ فِي الْأَرْضِ — اور ایسا تمکّن کہ آپ کے اختیارات میں کوئی دخل انداز نہ ہو۔ جہاں چاہیں اپنا حکم چلائیں۔ دُنیا میں حسنِ عمل اور تطہیرِ فکر و نظر کی اس سے بڑی جزا اور کیا ہو سکتی ہے۔ باقی رہی اس دُنیا سے اگلی منزل، سو وہاں کے مناصب و مدارج کے کیا کہنے:

۱۲/۵۷ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٥٧﴾

حسنِ عمل کے ایسے خوشگوار نتائج اسی دنیا تک محدود نہیں رہتے، یہ آخرت کی زندگی میں بھی مسلسل ساتھ جاتے ہیں اور وہاں ان کی کیفیت، اس دنیا کی خوشگواریوں سے بھی زیادہ اچھی ہوتی ہے۔

جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور تخریبی روش سے بچ کر، ان کے مُطابق زندگی بسر کریں، انہیں یہ سب کامرانیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے زمین سے متعلق انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور انہیں اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ملک کو قحط سے دوچار ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔ اس کی روک تھام (بلکہ مُلک کے معاشی نظام) کے سلسلہ میں انہوں نے کیا تدابیر اختیار کی تھیں، قرآنِ کریم میں ان کا ذکر نہیں آیا۔ تورات میں

---

[1] جس طرح اور جس مقصد کے لیے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے محلات میں پہنچایا گیا تھا۔ (مطالب الفرقان جلد پنجم صفحہ ۳۴۲)

البتہ اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ توراۃ کے بیانات یقینی نہیں سمجھے جاسکتے کیونکہ اس میں تحریف ہو چکی ہے لیکن اُن ارضی انتظامات کے سلسلہ میں اس میں جو کچھ آیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اس ضمن میں کس قسم کی تدابیر اختیار کی تھیں۔ کتاب پیدائش۔ باب ۴۷ میں ہے:

نظامِ یوسفی

اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی، اس لیے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی۔ حضرت یوسفؑ نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی، اُس غلّہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا، جمع کی اور یوسفؑ اُس نقدی کو فرعون کے گھر لایا۔ اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسفؑ سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے کیوں مریں؟ کیونکہ نقدی چُک گئی۔ یوسفؑ نے کہا کہ اپنے چوپائے دو اگر نقدی چُک گئی کہ میں تمہارے چوپایوں کے بدلے تمہیں روٹی دوں گا۔ وہ اپنے چوپائے یوسفؑ کے پاس لائے اور یوسفؑ نے گھوڑوں اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلّوں اور گدھوں کے بدلے اُن کو روٹیاں دیں۔ اور اُس نے ان کے سب چوپایوں کے بدلے میں انہیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گزر گیا، وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اُسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد ختم ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہمارے چوپاؤں کے گلّے بھی لے لیے۔ سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بدنوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے اور یوسفؑ نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لیے مول لی۔ کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے ان کو نپٹ تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ سو اُس نے اُنہیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اُس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے۔ اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انہیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لیے اُنہوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔ تب یوسفؑ نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو! میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لیے مول لیا۔ لو یہ بیج تمہارے لیے ہے۔ کھیت بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہو گا کہ تم پانچواں حصّہ فرعون کو دو گے اور چار حصّے کھیت میں بیج بونے

اور تمہاری خوراک اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لیے ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں۔ ہم اپنے خداوند کے حضور میں مورد رحم ہوں اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے اور یوسفؑ نے ساری مصر کی زمین کے لیے یہ آئین بنایا جو آج کے دن تک مقرر ہے کہ فرعون پانچواں حصہ لے گا، مگر کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جب علّتِ مرض پر غور کیا تو اُنہوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ اُنہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس طرح تمام مزروعہ زمینیں انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آ گئیں۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس زمین کو کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آسانیاں بہم پہنچائیں تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں۔ اب یہ کاشت کار اپنی محنت کے ماحصل کے آپ مالک تھے۔ زمیندار کاشت کار کی محنت کے ماحصل میں شریک نہیں تھے۔ تفصیل کے لیے میری کتاب "نظامِ ربوبیت" دیکھئے۔

اس کے بعد قحط سالی شروع ہوئی تو مصر کے ارد گرد کے علاقوں کے لوگ بھی غلّہ لینے کے لیے اُسی چشمۂ فیض کی طرف آنے شروع ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا قبیلہ بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہُوا تو برادرانِ یوسفؑ غلّہ لینے آئے۔ حضرت یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن چونکہ یہ بات اُن کے بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ یوسفؑ اس مقامِ بلند پر فائز ہو گا، اس لیے انہوں نے آپ کو نہ پہچانا۔

(۱۲/۵۸) وَجَآءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ﴿٥٨﴾

(اس واقعہ پر کئی سال گزر گئے۔ اس کے بعد ملک میں قحط پڑا تو دور و نزدیک سے لوگ غلّہ لینے کے لیے دارالسلطنت میں آنے لگے۔ اس سلسلہ میں) یوسفؑ کے بھائی بھی آئے۔ یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ اُسے نہ پہچان سکے۔ (اس لیے کہ یہ بات اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ یوسفؑ اس مقام پر فائز ہو گا۔)

ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اُن سے "اُن کے گھر" کے تمام حالات کرید کرید کر پوچھے ہوں گے اور اسی طرح باتوں باتوں میں یہ بھی اُن سے کہلوا لیا ہوگا کہ ان کا ایک سوتیلا بھائی اور بھی ہے جو باپ کے پاس ہے۔ چنانچہ وہ واپس جانے لگے تو آپ نے اُن سے کہا کہ اب لوٹ کر آنا تو اپنے سوتیلے بھائی (بن یامین) کو بھی ساتھ لانا۔

۱۲/۵۹—۶۰ وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٥٩﴾ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾

جب یوسفؑ نے اُن کے لیے غلّہ وغیرہ لدوا دیا تو جاتے وقت اُن سے کہا کہ اب کے جو آؤ تو اپنے ساتھ اپنے اس بھائی کو بھی لیتے آنا (جس کے متعلق تم نے کہا ہے کہ وہ باپ کی طرف سے تمہارا بھائی ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ (میں کوئی مستبد حاکم نہیں جو کسی پر ظلم و زیادتی کروں گا)۔ میں ماپ تول بھی پورا دیتا ہوں اور باہر سے آنے والوں کی مہمان نوازی بھی کرتا ہوں۔ (اس لیے تمہارے باپ کو — جس کے متعلق تم نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اُس بیٹے کو باہر بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوگا — اُسے یہاں بھیجنے پر کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیئے) اگر تم اُسے میرے پاس نہ لائے تو نہ تمہیں غلّہ مل سکے گا اور نہ ہی تم میرے قریب آسکو گے۔

انہوں نے کہا:

۱۲/۶۱ قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾

انہوں نے کہا ہم پوری کوشش کریں گے کہ ہمارا باپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اس باب میں کامیاب ہوجائیں گے اور اپنے بھائی کو اپنے ساتھ لے کر حاضر خدمت ہوں گے۔)

حضرت یوسفؑ نے ان کے دوبارہ آنے کے امکان کو مزید پختہ کرنے کے لیے اُن کی پونجی بھی اُن کی بوریوں میں رکھوا دی۔

۱۲/۶۲ وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٦٢﴾

یوسفؑ نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ ان لوگوں کی رقم، جس کے عوض انہوں نے غلّہ خریدا ہے (میری طرف سے) ان کی بوریوں میں اس طرح رکھ دو کہ جب یہ گھر پہنچ کر اپنا سامان کھولیں تو (یہ رقم اُن کے سامنے آجائے اور) یہ پہچان لیں کہ یہ انہی کی رقم ہے اور اس طرح یہ دوبارہ غلّہ لینے کے لیے آجائیں۔

اُنہوں نے واپس جاکر حضرت یعقوبؑ سے "امیرِ مصر" (یعنی حضرت یوسفؑ) کی شرط بیان کی:

۱۲/۶۳ فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

چنانچہ جب وہ لوٹ کر اپنے باپ کے پاس گئے تو انہوں نے (دیگر واقعات بیان کرنے کے بعد) کہا کہ ہم سے کہا گیا ہے کہ تمہیں دوبارہ غلّہ اُسی صورت میں مل سکے گا کہ تم اپنے بھائی کو بھی ساتھ لاؤ (اگر ایسا نہ کیا تو، غلّہ ملنا تو ایک طرف، تم میرے قریب تک نہیں پھٹک سکو گے) لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہم غلّہ لا سکیں۔ اور ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اس کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔

اس پر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا:

۱۲/۶۴ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

اس پر (حضرت یعقوبؑ) نے کہا کہ کیا میں اس کے بارے میں بھی تم پر اسی طرح اعتبار کر لوں جس طرح اس سے پہلے، اس کے بھائی (یوسفؑ) کے بارے میں تم پر اعتبار کیا تھا؟ اس لیے (میں اسے تمہاری حفاظت میں نہیں دے سکتا) یہ اللہ ہی کی حفاظت میں رہے گا کیونکہ وہی سب سے بہتر محافظ اور سامانِ رحمت مہیا کرنے والا ہے۔

اس کے بعد جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اس میں اپنی پونجی موجود پائی تو اس پر انہوں نے (حضرت یوسفؑ کی توقع کے مطابق) باپ سے مزید اصرار شروع کر دیا۔

۱۲/۶۵ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا

وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾

پھر جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ غلّے کے ساتھ، ان کی رقم بھی واپس کر دی گئی ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ہمیں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے کہ ہمیں غلّہ بھی مل جائے اور قیمت بھی لوٹا دی جائے۔ (اب آپ سوچیئے کہ اگر ہم محض اس لیے غلّہ لینے نہ جاسکے کہ آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ نہیں بھیجنا چاہتے تو اس سے کس قدر نقصان ہوگا؛ لہٰذا ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور) اپنے گھرانے کے لیے غلّہ لے آئیں۔ ہم اس کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔ (اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہم اس کے حصّہ کا) ایک اُونٹ کا بوجھ اور بھی لا سکیں گے۔ جو غلّہ ہم لائے ہیں وہ بہت تھوڑا ہے۔ یونہی ختم ہو جائے گا۔)

بالآخر حضرت یعقوبؑ نے ان سے اللہ کے نام پر عہد لیا کہ وہ بن یامین کو بخیریت واپس لے آئیں گے اور اس کے بعد اُسے جانے کی اجازت دی۔

۱۲/۶۶ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

باپ نے کہا کہ (اب جو تم مجھے اس طرح مجبور کر رہے ہو تو میں اسے تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ) تم اللہ کو درمیان میں رکھ کر میرے ساتھ اقرار کرو کہ تم اسے میرے پاس ضرور واپس لے آؤ گے، بجز اس کے کہ تم خود ہی کہیں گھِر لیے جاؤ اور اس طرح بالکل بے بس ہو جاؤ) جب انہوں نے اس بات کا عہد دے دیا تو اس نے کہا کہ ہم نے جو باہمی قول و اقرار کیا ہے، اللہ اس پر نگہبان ہو۔

تورات میں ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی پہلی مرتبہ مصر گئے ہیں تو اُن پر جاسوسی کا شبہ گزرا تھا حضرت یعقوبؑ کے دل میں یہ کھٹکا تھا کہ مبادا ان پر دوبارہ کچھ ایسا ہی شبہ گزر جائے اور یہ گھیر لیے جائیں اور ان کے ساتھ بن یامین بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ اس لیے اُنہوں نے احتیاطاً اُن سے کہا کہ مصر میں داخل ہونا تو ایک جتھے کی صورت میں نہ جانا، الگ الگ دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔

۱۲/۶۷ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ

مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

جب وہ جانے لگے تو باپ نے ان سے کہا کہ (دیکھو بیٹا!)جب تم اُس شہر میں جاؤ تو سب کے سب ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا، الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا (اکٹھے داخل ہوئے تو اجنبیوں کا ایک جتھہ دیکھ کر، شہر والوں کی نظریں خواہ مخواہ تمہاری طرف اُٹھنے لگ جائیں گی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ میرے دل میں یونہی ایک خیال سا آگیا ہے جس کی بنا پر میں نے یہ بات احتیاطاً تم سے کہہ دی ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کے بعد، تم ہر خطرہ سے مامون ہو جاؤ گے اور تمہیں کسی احتیاط اور انتظام کی ضرورت نہیں رہے گی) میری یہ احتیاطی تدبیر تمہیں کسی چیز سے بے نیاز نہیں کر سکتی جو (وقت اور موقع کے لحاظ سے) قانونِ خداوندی کے مطابق کرنی چاہیئے۔ یاد رکھو! امن اور خطرہ، نفع اور نقصان سب خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو اس کا اختیار نہیں۔ میرا بھروسہ بھی اسی پر ہے (اور تمہیں بھی اسی پر اعتماد کرنا چاہیئے ۔ اور ایک میں اور تم ہی کیا) ہر بھروسہ کرنے والے کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد ہے:

[۱۲/۶۸] وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

چنانچہ ان بھائیوں کا قافلہ اسی طرح شہر میں داخل ہوا جس طرح باپ نے کہا تھا۔ لیکن (جیسا کہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا) یہ تدبیر اس واقعہ کو روک نہیں سکتی تھی جو قانونِ خداوندی کی رُو سے یہاں پیش آنے والا تھا (اور جس کی رُو سے بن یامین کو یہاں روک لیا جانا تھا) یہ تدبیری احتیاط محض ایک خیال کا نتیجہ تھی جو یعقوبؑ کے دل میں پیدا ہوا اور جس کی خلش کو اُس نے اس طرح دور کر لیا۔ یہ خیال بھی علم و دانش پر مبنی تھا (یونہی توہم پرستی نہیں تھا) اس لیے کہ یعقوبؑ کو ہم نے علم و فراست عطا کر رکھی تھی۔ وہ علم و فراست جس سے اکثر لوگ محروم ہوتے ہیں۔

جب یہ قافلہ حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا تو آپ نے اپنے بھائی (بن یامین) کو بتا دیا کہ میں تیرا بھائی ہوں۔ غمگین نہ ہو۔

۱۲/۶۹ وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۶۹﴾

جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس ٹھہرایا اور اُسے بتا دیا کہ میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں اور ساتھ ہی اس کی بھی تلقین کر دی کہ دوسرے بھائیوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کی وجہ سے تم رنجیدہ خاطر نہ ہونا۔

حضرت یوسفؑ ہزار دل سے چاہتے ہوں گے کہ بن یامین اُن کے پاس رہ جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا تاوقتیکہ اُسے یا تو یونہی روک لیتے یا بھائیوں پر اس راز کا انکشاف کر دیتے کہ وہ کون ہیں؟ اوّل الذکر مرفوع القلم تھا، اس لیے کہ قانونِ مملکت اس کی اجازت نہیں دیتا تھا اور استبداد آپ کی ذات سے ناممکن تھا۔ دوسری طرف بھائیوں پر اس راز کا انکشاف ابھی قبل از وقت تھا۔ اس لیے آپ نے مجبورًا دل پر پتھر رکھ کر اُن کے ساتھ بھائی کو بھی الوداع کہہ دیا۔ حضرت یوسفؑ نے اُن کی واپسی کا سامان مہیا کر دیا۔ جب یہ سامانِ سفر تیار ہو رہا تھا تو اُن بھائیوں میں سے ایک نے چُپکے سے حضرت یوسفؑ کا شاہی کٹورا بن یامین کی بوری میں رکھ دیا۔ نیّت یہ ہوگی کہ اگر کسی کی نگاہ نہ پڑی تو کٹورا گھر پہنچ جائے گا اور اگر پتہ چل گیا تو بن یامین بدنام ہوگا اور باپ کی نظروں سے گر جائے گا۔

اس کے بعد قافلہ روانہ ہو گیا۔ جب محلات کے کارندوں نے مختلف چیزوں کا جائزہ لیا تو شاہی کٹورا کو وہاں نہ پایا۔ چونکہ یہ کنعانی قافلہ وہاں ٹھہرا تھا اس لیے اُن کا لامحالہ انہیں پر شُبہ گزرا۔ وہ اُن کے پیچھے گئے اور انہیں آواز دے کر ٹھہرا لیا اور پوچھا کہ کیا تم پیالہ لے آئے ہو؟

۱۲/۷۰—۷۲ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿۷۰﴾ قَالُوا وَاَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُونَ ﴿۷۱﴾ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ

جَآءَ بِهٖ حِمۡلُ بَعِيۡرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيۡمٌ ﴿۷۲﴾

جب یوسفؑ نے ان کا (واپسی کا) سامان تیار کرا دیا تو (اُن بھائیوں میں سے ایک نے) شاہی کٹورا بنیامین کی بوری میں رکھ دیا (کہ اگر پتہ نہ چلا تو کٹورا گھر پہنچ جائے گا اور اگر پتہ چل گیا تو بنیامین بدنام ہوگا جب اُن کی روانگی کے بعد یوسفؑ کے آدمیوں نے دیکھا کہ کٹورا گم ہے تو اُن میں سے) ایک پکارنے والے نے پکارا کہ او قافلہ والو ٹھہرو۔ تم چور ہو۔ (۱۲/۷۵ ، ۱۲/۸۳ ، ۱۲/۸۹)

وہ یوسفؑ کے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ تمہارا کیا گم ہوگیا ہے (جو ہمیں چور ٹھہراتے ہو)!

انہوں نے کہا کہ شاہی کٹورا گم ہوگیا ہے۔ جو شخص اُسے ڈھونڈ نکالے اُسے ایک بارِ شتر انعام ملے گا (ان کارندوں کے سردار نے کہا کہ) اس کا میں ضامن ہوں (کہ یہ انعام ضرور ملے گا)

ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ برادرانِ یوسفؑ میں سے ایک نے یہ کٹورا بنیامین کی بوری میں رکھ دیا تھا تو اس کی دلیل یہ ہے کہ آگے چل کر جب حضرت یوسفؑ نے اپنے متعلق بھائیوں کو بتایا کہ وہ یوسفؑ ہیں تو اُن سے کہا کہ۔ هَلۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا فَعَلۡتُمۡ بِيُوۡسُفَ وَاَخِيۡهِ (۱۲/۸۹) تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟۔ بنیامین کے ساتھ اُنہوں نے خاص طور پر کیا کیا تھا، اس کا ذکر اس قصے میں نہیں، بجز اس مقام کے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بنیامین کی بوری میں یہ کٹورا انہی بھائیوں میں سے کسی نے رکھا تھا اور یہی وہ سازش تھی جس کی طرف حضرت یوسفؑ نے اشارہ کیا تھا۔

بہرحال شاہی کارندوں نے اُن سے پوچھ گچھ شروع کی اور اُنہوں نے قسمیں کھانی شروع کر دیں کہ ہم چور نہیں ہم تو ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آچکے ہیں۔ تم نے دیکھ لیا تھا کہ ہم نے کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں کی تھی۔

۱۲/۷۳ قَالُوۡا تَاللّٰهِ لَقَدۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا جِئۡنَا لِنُفۡسِدَ فِى الۡاَرۡضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيۡنَ ﴿۷۳﴾

یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ خدا شاہد ہے کہ ہم یہاں اس لیے نہیں آئے کہ کسی قسم کی شرارت پیدا کریں یا قانون شکنی کریں (ہم یہاں پہلے بھی آچکے ہیں۔ اس لیے) تم ہمارے متعلق جانتے ہو (کہ ہمارا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں۔ یقین مانیے! ہم چور نہیں ہیں۔

شاہی کارندوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ یونہی سہی۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اگر تلاشی لینے پر پیالہ تمہارے پاس نکل

آیا تو اس کی کیا سزا ؟

۱۲/۷۴ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾

شاہی کارندوں نے کہا کہ اگر تم جھوٹے نکلے تو اس کی کیا سزا ؟

انہوں نے جواب دیا کہ سزا واضح ہے۔ جو چور ہو' وہ اپنے جرم کی پاداش میں اپنی سزا آپ بن جائے۔ یعنی اُسے روک لیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں کا یہی دستور ہے۔

۱۲/۷۵ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

(اُن میں سے جنھیں معلوم تھا کہ کٹورا کس کی بوری میں ہے ۱۲/۷۶) کہا کہ جس کی بوری میں کٹورہ نکلے، وہ اس کے بدلے میں دھر لیا جائے۔ ہم اپنے ہاں مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔

چنانچہ کارندوں کے سردار نے (جس نے پہلے کہا تھا کہ جو پیالہ لے آئے اُسے انعام دیا جائے گا اور اس کا میں ضامن ہوں) تلاشی لینی شروع کر دی اور پیالہ بن یامین کی بوری سے برآمد ہو گیا۔

۱۲/۷۶ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ .....

تب شاہی کارندوں نے بوریوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ پہلے اور بھائیوں کی بوریاں دیکھیں (تو ان میں کٹورہ نہ ملا)۔ آخر میں یوسف کے بھائی کی بوری دیکھی تو اس میں سے کٹورا نکل آیا۔

یہاں تک دیکھئے کہ ہوا کیا ہے ؟ حضرت یوسف چاہتے تھے کہ اپنے بھائی (بن یامین) کو اپنے پاس رکھ لیں لیکن (اُن وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) وہ ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ برادرانِ یوسف میں سے ایک نے بنیامین کی بوری میں کٹورا رکھ دیا۔ کٹورہ حاصل کرنے یا بن یامین کو بدنام کرنے کی غرض سے — جب کٹورہ کی تلاش ہوئی تو برادرانِ یوسف نے خود ہی کہہ دیا کہ جس کے پاس چوری کا کٹورہ نکلے گا وہ ماخوذ ہو جائے گا، اور اپنی سزا بھگتنے کے لیے یہاں رہ جائے گا۔ کٹورا بنیامین کی بوری سے نکلا اور اس طرح اس کے یہاں رُکنے کی صورت پیدا ہو گئی۔

قرآن کریم میں اشارۃً یا کنایۃً بھی ایسا نہیں کہا گیا کہ اُس کٹورے کے چھپانے اور برآمد کرانے میں حضرت یوسفؑ کا ہاتھ تھا یا اُن کی اسکیم تھی۔ لیکن جنہیں حضرات انبیاء کرامؑ کو مطعون کرنا مقصود ہو وہ ایسے افسانے تراش لیتے ہیں۔ تورات، کتاب پیدائش۔ باب ۴۴ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے وہ پیالہ خود ہی بن یامین کی بوری میں رکھوا دیا اور جب قافلہ روانہ ہو چکا تو خود ہی اپنے کارندوں کو تعاقب میں بھیج دیا کہ اُن کی تلاشی لیں اور چور کو پکڑ کر لے آئیں۔

لیکن تورات پر کیا افسوس کہ وہ تو ہے ہی محرّف، اور یہودیوں کا کیا گلہ کہ وہ تو اپنے انبیاءؑ کی طرف ایسے ایسے افسانے منسوب کر دیتے ہیں جن کے تصور تک سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جائیں۔ افسوس تو اپنے ہاں کے مفسرین پر آتا ہے کہ وہ بھی اس باب میں یہودیوں سے کم نہیں ؎

زگل فروش ننالم کہ از اہل بازار است
تپاک گرمیٔ رفتار باغبانم سوخت

تفسیر ابن کثیر ہمارے ہاں کی مستند تفسیر ہے۔ اس میں اس واقعہ کے ضمن میں پہلے کہا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے بنیامین سے کہہ دیا تھا کہ:

"میں کوشش میں ہوں کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں اپنے پاس روک لوں۔"

اس "کوشش" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جب آپ اپنے بھائیوں کو حسبِ عادت ایک ایک اونٹ غلّے کا دینے لگے اور ان کا سامان لدنے لگا تو اپنے چالاک ملازموں سے چپکے سے اشارہ کر دیا کہ چاندی کا شاہی کٹورا بن یامین کے اسباب میں چپکے سے رکھ دیں ...... پس آپ کے ملازمین نے ہوشیاری سے وہ پیالہ آپ کے بھائی بن یامین کی خورجی میں رکھ دیا۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ کس طرح کٹورا بن یامین کی خورجی سے برآمد کرا لیا گیا اور انہیں روک لیا۔ اور اس پر تبصرہ یوں کیا ہے کہ:

یہ تھی وہ ترکیب جو جناب باری تعالیٰ نے اپنی حکمت اور حضرت یوسفؑ اور بن یامین کی مصلحت کے لیے حضرت یوسفؑ کو سکھائی تھی۔ (تفسیر ابن کثیر اردو ترجمہ تیرہواں پارہ صفحہ ۵)

غور فرمائیے۔ اِن حضرات کی تفسیر کی رُو سے (معاذ اللہ) خدا ایک فریب کارانہ اسکیم تجویز کر کے اپنے نبی کو سکھاتا ہے اور نبی اس پر عمل کر کے اپنا مطلب حاصل کر لیتا ہے اور اس کے بعد یہ صاحب ارشاد

فرماتے ہیں:

خدا جس کے درجے بڑھانا چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔ (معاذاللہ۔ استغفراللہ)

یہ ہے آپ کے جلیل القدر ائمۂ مفسرین کے فہمِ اسلامی کی مثال۔ انہیں نہ خدا کی عظمت کا کوئی احساس ہے، نہ حضرات انبیاءِ کرام کی عصمت کا کوئی اندازہ۔ نہ انہیں اقدارِ خداوندی کا کوئی علم ہے، نہ عالمگیر ضابطۂ اخلاق کا ادراک بلکہ ان پر نہیں، کہ ان کے علم و فہم کی سطح ہی ایسی تھی۔ پوچھئے ان حضرات سے جو ان تفسیروں کو سینے سے لگائے اور سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ انہیں پڑھتے بھی ہیں اور پڑھاتے بھی۔ اور اس تعلیم کی رو سے علاّمہ قرار پاتے ہیں۔

جہاں تک حضرت یوسفؑ کا تعلق ہے قرآن نے چار لفظوں میں اُن کے عُلوِ مرتبت کی شہادت دیدی۔ فرمایا:

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ط (۱۲/۷۶)

اس سے واضح ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جو کچھ کیا تھا اس سے ان کے درجات بلند ہوئے تھے۔ اس بنیادی حقیقت کو سامنے رکھ کر واقعہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت یوسفؑ بنیامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ مملکت کا قانون ان کے راستے میں حائل تھا۔ وہ اگر قانون شکنی کرتے (کھلے بندوں یا کسی مخفی طریق سے) تو وہ اپنے اس مقامِ بلند سے نیچے گر جاتے جس پر وہ مملکت میں فائز تھے۔ وہ اگر فریب کارانہ طریق سے اپنی مطلب براری کرتے تو مملکت کے پیمانوں کے علاوہ میزانِ خداوندی میں بھی ان کا وزن کم ہو جاتا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہوں نے ضبطِ نفس سے کام لیا۔ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جس سے وہ اپنے مقامِ بلند سے گر جاتے۔ اس ضبطِ نفس سے ان کی عظمتِ کردار اور بڑھ گئی۔ خدا کا قانونِ مشیّت ایسا ہی ہے کہ جو خدا کی عاید کردہ پابندی کی پاسداری کرتا ہے اس کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (۱۲/۷۶)

حضرت یوسفؑ کے ارادے یا عمل دخل کے بغیر جو کچھ ہو گیا اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ کَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ..... (۱۲/۷۶) اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "۔ اور اس طرح ہم نے (یعنی خدا نے) یوسفؑ کے لیے ایک تدبیر کر دی"۔ اور اس سے کہا یہ جاتا ہے کہ یہ سب کچھ (معاذاللہ) خدا نے کیا تھا۔ ایسا کہنا قرآن کریم کے اسلوبِ بیان سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات ایسے ہیں جن میں خدا نے کسی عمل (یا بات) کو اپنی طرف منسوب کیا ہے لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ خدا نے خود ایسا کیا تھا۔ دو ایک مثالیں دیکھئے:

۱۔ ہم بچوں کو بولنا سکھاتے ہیں۔ لیکن قرآن میں ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۞ (۵۵/۳-۴) خدا

نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا" اسی طرح ہم بچوں (بلکہ ناخواندہ بڑوں) کو لکھنا سکھاتے ہیں لیکن ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۹۶/۴﴾۔ خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے (لکھنا) سکھایا۔ ظاہر ہے کہ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان میں گویائی (نطق)..... تحریر کی صلاحیت ودلیعت کر دی ہے۔ اِن صلاحیتوں سے کام لینا (نہ لینا) انسان کا اپنا کام ہے۔ خدا نے کسی کو خود بولنا سکھایا ہے نہ لکھنا۔

۲۔ سورۃ البقرہ میں ہے کہ جب کاتب کو دستاویز لکھنے کے لیے کہا جائے تو وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ﴿۲/۲۸۲﴾ کاتب کو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا ہے اُسے چاہیئے کہ اس طرح اس دستاویز کو لکھ دے" ظاہر ہے کہ اس سے بھی مراد تحریر کی وہ صلاحیت ہے جسے خدا نے انسان میں ودلیعت کر رکھا ہے۔ وہ خود کاتب کو لکھنا نہیں سکھاتا۔

۳۔ سورۃ مائدہ میں شکاری جانوروں کے متعلق ہے۔ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ..... ﴿۵/۴﴾ جو کچھ تمھیں اللہ نے سکھایا ہے اُس کے مطابق تم شکار کرنیوالے جانوروں کو سدھاتے ہو" ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ شکاریوں کو یہ نہیں سکھاتا کہ وہ شکار کرنے والے جانوروں کو کس طرح سدھائیں۔

۴۔ سورۃ یٰسین میں ہے۔ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۳۶/۴۱﴾ اور یہ بات بھی ان کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی نشانی ہے کہ ہم ان کے بال بچوں کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیتے ہیں" حالانکہ وہ خود سوار ہوتے ہیں یا ان کے بڑے انہیں سوار کراتے ہیں (کیا قانونِ فطرت کے مطابق عمل کرنے کو خدا نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا؟)

۵۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ضروریات کے لیے مختلف قسم کے اسباب اور سامان پیدا کیے ہیں جنھیں انسان اپنی منشاء کے مُطابق استعمال میں لاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُسے بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ نحل میں ہے۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا ﴿۱۶/۸۰﴾ "اللہ تعالیٰ نے تمھارے گھروں کو تمہارے لیے جائے سکونت بنایا ہے" اس کے بعد ہے۔ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا..... ﴿۱۶/۸۰﴾ خدا نے مویشیوں کی کھالوں سے تمھارے لیے گھر بنائے"

۶۔ ایک بات اصولاً سمجھ لینی چاہیئے۔ خدا کا اٹل قانون یہ ہے کہ جو شخص (خاص مقدار سے زیادہ) سنکھیا کھائیگا وہ

ہلاک ہو جائے گا۔ وہ کبھی کہتا ہے کہ جو شخص سنکھیا کھائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا اور کہا یہ کہ سنکھیا کھانے والے کو ہم ہلاک کر دیتے ہیں۔ معروف آیت ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ..... (۲/۷) "اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی"۔ اور اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (۸۳/۱۴) جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ زنگ بن کر اُن کے دلوں پر چڑھ جاتا ہے (اور یوں اُن پر مہر لگ جاتی ہے۔)

ان مقامات کی مزید تشریح کے لیے سابقہ جلدوں میں عنوان "تقدیر" دیکھئے۔ نیز لغات القرآن اور کتاب التقدیر میں مَا يَشَآءُ اور مَنْ يَّشَآءُ (قانونِ مشیّت)، کے موضوع۔

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے تو اس کا بالضرور مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اُس کام کو اُس نے خود کیا ہے ۔ وہ کچھ کرتا انسان ہی ہے۔ کبھی قانونِ قدرت کیمطابق، کبھی ان صلاحیتوں کے مطابق جو انسان میں ودیعت کی گئی ہیں اور کبھی ان اسباب و ذرائع کو استعمال میں لاکر جو اس کام کے لیے ضروری ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (۱۲/۷۶) تو اس سے یہ مراد نہیں کہ اللہ نے (کٹورا کی اسکیم) خود وضع کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اسباب و ذرائع پیدا ہو گئے جن کی رُو سے (حضرت) یوسفؑ کی خواہش بھی پوری ہو گئی اور ان پر حرف بھی نہ آیا۔ آیت ۷۶ اور اس کا مفہوم یوں ہوگا:

۱۲/۷۶ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِىْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝۷۶

تب شاہی کارندوں نے بوریوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ پہلے اور بھائیوں کی بوریاں دیکھیں (تو ان میں کٹورا نہ ملا) آخر میں یوسفؑ کے بھائی کی بوری دیکھی تو اس میں سے کٹورا نکل آیا۔

(دیکھو! بات چلی کیسی تھی اور رُکی کہاں جاکر! اس سوتیلے بھائی نے بنیامین کی بوری میں کٹورا کس نیت

سے رکھا تھا، لیکن اس کا یہ فعل یوسفؑ کے لیے بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کا موجب بن گیا، اس طرح ہم نے یوسفؑ کے لیے بنیامین کو روک لینے کی تدبیر پیدا کر دی، ورنہ شاہِ مصر کے قانون کے مطابق، وہ اپنے بھائی کو اپنے پاس نہیں روک سکتا تھا۔ اس کے لیے مشیت ہی کوئی تدبیر کر سکتی تھی (جس سے یوسفؑ کی دلی آرزو بھی پوری ہو جائے اور اسے کوئی ایسی بات بھی نہ کرنی پڑے جس سے وہ اپنے مقامِ بلند سے گر جائے، یوں ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق بلندئ مدارج عطا کر دیتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کا علم، ہر صاحبِ علم کی علمی سطح سے بلند ہوتا ہے۔

(ضمناً) لغاتُ القرآن میں دیکھئے۔ دین کے معنیٰ قانون بھی ہیں۔ اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ ۔ بادشاہ کے قانون کے مطابق یوسفؑ اپنے بھائی کو روک نہیں سکتا تھا۔

اب معاملہ حضرت یوسفؑ کے سامنے آچکا تھا۔ وہ اس سے پہلے بنیامین کو اپنے متعلق بتا چکے تھے۔ اس لیے بنیامین کے لیے نہ تو اس الزام سے گھبرانے کی کوئی وجہ تھی اور نہ معاملے کے حضرت یوسفؑ کے سامنے پیش ہونے سے کوئی تشویش۔ حضرت یوسفؑ نے تو اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا، لیکن برادرانِ یوسفؑ کو بنیامین سے پہلے ہی دشمنی تھی (اس لیے کہ وہ یوسفؑ کے باپ کا چہیتا تھا)۔ اس لیے جوشِ حسد و عداوت میں بے اختیار پکار اُٹھے کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو کچھ عجب نہیں، یہ اُن کے ہاں کا معمول ہے۔ اس کا ایک بھائی تھا وہ بھی ایسا ہی تھا۔ اندازہ فرمائیے کہ حضرت یوسفؑ نے کس دل سے اس الزام کو سُنا ہو گا لیکن ابھی مصلحت کا تقاضا تھا کہ اپنے آپ کو اُن پر ظاہر نہ کیا جائے۔ اس لیے سُن کر پی گئے۔ اور کہا تو صرف اتنا کہ اپنے بھائی کو چور بنا کر تم اپنے متعلق بھی کچھ اچھا ظن پیدا نہیں کر رہے۔ تم بھی تو اسی خانوادہ کے نونہال ہو۔

۱۲/۷۷ قَالُوٓا۟ إِن يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَّهُۥ مِن قَبْلُ ۚ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِى نَفْسِهِۦ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ أَنتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۖ وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ﴿٧٧﴾

اس پر یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس کا ایک اور بھائی تھا۔ اس نے بھی اسی طرح پہلے چوری کی تھی۔ (لہٰذا، یہ بات ان کے ہاں عادۃً چلی آ رہی ہے)۔

(اُف! کس قدر زہریلا تھا یہ نشتر جو یوسفؑ کے دل کی گہرائیوں میں اُتارا گیا؟ جی میں تو آیا ہوگا کہ ان کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دے لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ اس لیے یوسفؑ نے) اس بات کو دل میں رکھا۔ اور صرف اتنا کہا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا یقینی علم تو خدا کو ہے۔ لیکن (اگر واقعہ یہی ہے جو تم بیان کر رہے ہو، تو) تم شریف لوگ نظر نہیں آتے۔ (اس لیے کہ تم سوتیلے ہی سہی، ہو تو اُنہی چوروں کے بھائی! خاندان تو تمہارا بھی وہی ہے)۔

قرآن کریم نے ان کے الزام کی تردید ایک لفظ میں کر دی جب کہا فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ۔ یوں سمجھئے جیسے ہم کہیں کہ "یوسفؑ اُسے پی گیا"۔ ادبِ لطیف وعمیق کی ایک خصوصیت 'ایمائیت' (SUGGESTIVENESS) ہوتی ہے۔ یعنی بات کھُلے کھُلے الفاظ میں کہنے کی بجائے بلیغ اشارے میں کی جائے اور اسے قاری کے حُسنِ فہم پر چھوڑ دیا جائے کہ۔ "خارے دید واحوالِ چمن گفت"۔ قرآن مجید میں یہ اندازِ بیان بھی پایا جاتا ہے اور اس کی ایک مثال فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ جو الزام برادرانِ یوسفؑ نے عاید کیا تھا وہ جھوٹا تھا لیکن یوسفؑ اسے (سرِدست) زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا۔

قرآن نے تو قرینہ سے بتا دیا کہ الزام جھوٹا تھا۔ لیکن ہمارے مفسرین حضرات بھلا اسے کب مان سکتے ہیں۔ انہوں نے دھڑلّے سے کہا کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ سچ تھا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

وہ واقعہ یہ تھا کہ (یوسفؑ بچپن میں) اپنے نانا کا بُت چپکے سے اُٹھا لائے تھے اور اُسے توڑ دیا تھا۔

اس کے بعد ہے کہ:

یہ بھی مروی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ایک بڑی بہن تھی جن کے پاس اپنے والد حضرت اسحٰق علیہ السلام کا ایک کمر پٹہ تھا جو خاندان کے بڑے آدمی کے پاس رہا کرتا تھا۔ حضرت یوسفؑ پیدا ہوتے ہی اپنی ان پھوپھی صاحبہ کی پرورش میں تھے۔ انہیں حضرت یوسفؑ سے کمال درجے کی محبت تھی۔ جب آپ کچھ بڑے ہوئے تو حضرت یعقوبؑ نے آپ کو لے جانا چاہا۔ بہن صاحبہ سے درخواست کی۔ لیکن بہن نے جُدائی کو ناقابلِ برداشت بیان کر کے انکار کر دیا۔ اُدھر آپ کے والد صاحب حضرت یعقوبؑ کے شوق کی بھی انتہا نہ تھی۔ سر ہو گئے۔ آخر بہن صاحبہ نے فرمایا۔ اچھا کچھ دنوں رہنے دو، پھر لے جانا۔ اسی اثناء میں انہوں نے ایک دن وہی کمر پٹہ حضرت یوسفؑ کے کپڑوں کے نیچے چھُپا دیا۔ پھر تلاش شروع کی۔ گھر بار چھان مارا۔ نہ ملا۔ شور مچا۔ آخر یہ ٹھہری کہ گھر میں جو ہیں اُن کی تلاشیاں لی جائیں۔ لی گئیں۔ کسی کے پاس کچھ ہو تو

نکلے۔ آخر حضرت یوسفؑ کی تلاشی لی گئی۔ ان کے پاس سے برآمد ہؤا۔ حضرت یعقوبؑ کو خبر دی گئی اور ملّتِ ابراہیمیہ کے قانون کے مطابق آپ اپنی پھوپھی کی تحویل میں کر دیئے گئے اور پھوپھی نے اس طرح اپنے شوق کو پورا کیا۔

اس بات کا طعنہ آج بھائی دے رہے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر، اُردو ترجمہ، پارہ تیرھواں صفحہ ۴۶)

یہ نقشہ کھینچا جا رہا ہے خانوادۂ نبوّت کا۔! (استغفراللہ)

سوال یہ ہے کہ جو کچھ یہ حضرات کہتے ہیں اس کی اِن کے پاس دلیل یا اتھارٹی کیا ہوتی ہے؟ اس کی اتھارٹی ہوتی ہے "یہ بھی مروی ہے" یعنی روایات میں یوں آیا ہے۔ دین میں تحریف کی یہ سازش بڑی منظّم ہے۔ منافقین نے جھوٹی روایات وضع کیں اور ان کا نام رکھا "رسُولؐ اللہ کی احادیث"۔ جامعینِ احادیث (امام بخاری و مسلم وغیرہ) نے انہیں اپنے مجموعوں میں داخل کرلیا اور اس لیے انہیں صحیح احادیث ہونے کی سند مل گئی۔ طبری نے انہی کی بنا پر تاریخ مرتّب کی اور اس طرح انہیں دوہری سند حاصل ہوگئی۔ یعنی روایات میں یوں آیا ہے اور تاریخ نے یہ کہا ہے۔ اس کے بعد مفسّرین نے اپنی تفسیروں میں اور مؤرخین نے اپنی تاریخ میں "مروی ہے"، کہہ کر انہیں بلاغل وغش درج کرلیا۔ انہی کے مجموعہ کا نام "اسلام" ہے جو ہزار بارہ سو سال سے رائج چلا آرہا ہے۔ اب نہ ان روایات پر کسی قسم کی تنقید ہوسکتی ہے (کیونکہ انہیں "احادیثِ رسُولؐ اللہ" کہا جاتا ہے، نہ اِن تفسیروں کو الگ کرکے قرآن مجید کو سمجھایا جا سکتا ہے) ایسا کرنا "سلف صالحین" کے مسلک کے خلاف ہوگا۔

اس اسلام کی وجہ سے ہم تو ڈوبے ہی تھے، حقیقی اسلام کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔

جب جذباتِ بغض و عناد ٹھنڈے ہوئے تو برادرانِ یوسفؑ منّت سماجت پر اُتر آئے۔ پست کردار میں یہی کیفیت ہوتی ہے ــ کِذب تراشی اور تملّق پیشگی۔ کہنے لگے۔

(۱۲ ـ ۷۸) قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

اُنہوں نے کہا کہ اے عزیزِ مصر! اس (بن یامین) کا باپ بہت بوڑھا ہے (اور وہ اس سے بہت محبّت کرتا ہے) آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے اور اِسے چھوڑ دیجئے۔ ہم نے آپ کو بڑا ہی نیک انسان پایا ہے۔ آپ بڑے ہمدرد ہیں (اس لیے ہمیں اُمید ہے کہ آپ ہماری اس درخواست کو ضرور قبول کرلیں گے)

حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ چور اپنی سزا آپ بُھگتے۔ اب ہم

اس کی جگہ کسی دوسرے کو کیسے روک لیں۔

۱۲/۷۹ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

یوسفؑ نے کہا۔ معاذ اللہ! بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس شخص کو چھوڑ دیں جس سے چوری کا مال برآمد ہوا ہے اور اس کی جگہ ایک بے گناہ کو پکڑ لیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ صریح ظلم ہوگا۔

اسے نہ بھولیئے کہ بن یامین کو علم تھا کہ روکنے والا یوسفؑ ہے۔ اس لیے اس پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہو رہی تھی۔ جب وہ اپنی کوششوں میں مایوس ہو گئے تو الگ ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

۱۲/۸۰—۸۲ فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۗ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

جب وہ یوسفؑ کی طرف سے مایوس ہو گئے (کہ وہ ان کی بات نہیں مانے گا) تو الگ بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے۔ ان میں سب سے بڑے بھائی نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ تمہارے باپ نے تم سے (بن یامین کے بارے میں) اللہ کو درمیان رکھ کر محکم عہد لیا تھا۔ اور اس سے پہلے تم یوسفؑ کے معاملہ میں بڑی زیادتی کر چکے ہو۔ اس لیے (کم از کم) میں تو یہیں رہوں گا (باپ کے سامنے ہرگز نہیں جاؤں گا) تا آنکہ خود باپ مجھے (وہاں آنے کی) اجازت دے۔ یا اللہ میرے لیے کوئی اور فیصلہ کر دے۔ وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

تم باپ کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ تمہارے (لاڈلے) بیٹے نے (پرائے ملک) میں جاکر چوری کی ہے!
(ہم نے بے شک تم سے اس کی نگرانی اور حفاظت کا عہد کیا تھا لیکن) ہم انہی امور میں اس کی نگرانی کر سکتے تھے جو ہمارے علم میں واقع ہوتے۔ اس قسم کی باتوں میں جو اس نے ہم سے چھپاکر کرنی شروع کر دیں ہم اس کی کیا نگرانی کر سکتے تھے!

آپ اُن بستی والوں سے پوچھ لیجئے جہاں یہ واقعہ ہوا ہے۔ یا اُن قافلہ والوں سے دریافت کر لیجئے جن کے ساتھ ہم آئے ہیں کہ ہم سچ کہتے ہیں یا جھوٹ بولتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پیشتر ذرا اس نشتر کو دیکھتے جائیے جو اس طعن آمیز فقرہ میں چھپا ہوا ہے کہ یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ "اے باپ! تیرے بیٹے نے چوری کی ہے"۔ دل میں بغض و عناد کے جذبات نہ ہوتے تو سیدھی طرح کہتے کہ ہمارے بھائی نے چوری کی ہے۔ یا بن یامین نے چوری کی ہے۔ لیکن باپ کو جتا کر کہنا کہ دیکھ یہ ہے آپ کے اس بیٹے کی کرتوت، جسے آپ یوں سینے سے لگائے رکھتے تھے۔ کس قدر کلیجے کو چھلنی کر دینے والا گھاؤ ہے! اور پھر شقاوتِ قلب دیکھئے۔ یہ نشتر کس وقت رگِ جاں میں پیوست کیے جانے کی تجویز ہو رہی ہے؟ اس وقت جب ضعیف باپ پہلے ہی ایک بیٹے کے غم میں نیم سوختہ ہو رہا تھا اور اس کے بعد اب دوسرے بیٹے کے متعلق یہ خبر سُنائی جانے والی تھی کہ وہ بھی تم سے جُدا ہو گیا۔ یہ وقت تھا کہ اس خبر کو انتہائی ہمدردی کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا۔ لیکن قرآن کریم نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنی الطبع لوگوں کی قساوتِ قلبی ایسے مواقع پر اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔

قساوتِ قلبی کی ایک جھلک

چنانچہ بھائیوں نے ایسا ہی کیا اور کنعان میں آکر یہ قیامت خیز خبر ان جگر شگاف الفاظ میں باپ کے گوش گزار کر دی۔ حضرت یعقوبؑ نے اس پر پھر وہی فقرہ دہرایا جو بھیڑیئے والا افسانہ سُن کر بیٹوں سے کہا تھا۔

[۱۲/۸۳] قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

(چنانچہ اس مشورہ کے بعد وہ باپ کے پاس پہنچے۔ باپ نے جب یہ کچھ سُنا تو) کہا کہ (نہیں، بن یامین کبھی چوری نہیں کر سکتا) یہ سارا قصہ تمہارا خود وضع کردہ ہے جسے تمہارے دل نے تمہیں سُجھا دیا ہے۔ (در حقیقت کچھ اور ہے) میں اس پر بھی وہی کہوں گا جو اس سے پہلے یوسفؑ کے معاملہ پر کہا تھا۔ (۱۲/۱۸) کہ میرے

لیے یہی بہتر ہے کہ میں صبر سے ہمت سے کام لوں (اور گھر کا شیرازہ بکھرنے نہ دوں) مجھے اُمید ہے کہ ایک دن اللہ ان سب کو مجھ سے ملا دے گا۔ یعنی یوسفؑ، بن یامین اور وہ بڑا لڑکا جو وہاں رہ پڑا تھا۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے اور تمام معاملات کو حکمت اور تدبیر سے آخر تک پہنچانے والا ہے۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا پر غور کیجیے۔ حضرت یعقوبؑ نے اس بات کو کبھی دل سے نہیں مانا تھا کہ حضرت یوسفؑ واقعی ہلاک ہو چکے ہیں۔ اُنہیں یقین تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ اب جو بن یامین کے متعلق یہ سب کچھ سنا تو ان تمام واقعات پر غائر نگاہ ڈالنے سے آپ کی فراست نے بھانپ لیا کہ یہ کڑیاں کچھ غیر معمولی سی ہیں۔ اس سے آپ کی نگاہِ دُور رَس نے بن یامین کی گم گشتگی میں سب کے دوبارہ اکٹھے ہو جانے کی جھلک دیکھ لی (یعنی یوسفؑ، بن یامین اور وہ بڑا بیٹا جو باقیوں کے ساتھ نہیں آیا تھا) بن یامین کی جُدائی نے پچھلے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا اور یوسفؑ کی یاد اور بھی شدّت سے ستانے لگی۔ ہر چند انہیں امید کی جھلک نظر آ چکی تھی لیکن فراق آخر فراق ہے۔ جب حتماً مایوسی نہ ہو بلکہ بیم و رجا کا عالم ہو تو دردِ فراق کی شدّت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

(۱۲/۸۴) وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

اُس نے بیٹوں کی طرف سے رُخ پھیر لیا اور اس نئے زخم نے اس کے دل میں یوسفؑ کی یاد تازہ کر دی تو اُس نے آہ بھر کر کہا، "ہائے! یوسفؑ کا دردِ فراق!" وہ اس صدمہ سے بیقرار رہتا تھا اور شدّتِ غم کی وجہ سے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی تھیں۔

پھر اس آتشِ غم کی جگر سوزی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ چارہ ساز تو ایک طرف، کوئی غمخوار بھی پاس نہ تھا، بیٹے تھے تو ایسے کہ انہیں یوسفؑ اور بن یامین کے نام سے چڑ تھی۔ خود بوڑھے ہو چکے تھے۔ ایسے میں بیٹوں کی ہر بات سُننی پڑتی ہو گی اور ان باتوں کا زخم، داغِ جدائی سے بھی زیادہ کرب انگیز ہوتا ہو گا۔

(۱۲/۸۵) قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

(باپ کا یہ حال دیکھ کر بیٹے) ۔ بجائے اس کے کہ اس سے غمخواری اور غمگساری کریں، اکھڑ کہنے کہ) آپ اس قصے کو چھوڑیں گے بھی، یا ہر وقت "یوسف یوسف" پکارتے رہیں گے؟ اگر آپ یہی کچھ کرتے رہے تو خدا شاہد ہے، آپ اس غم میں گھل گھل کر مر جائیں گے۔ اور اگر مریں گے نہیں تو از کار رفتہ ضرور ہو جائیں گے۔

حضرت یعقوبؑ یہ سب کچھ سنتے اور جواب میں کہتے تو فقط اتنا کہ میں تم سے تو کچھ نہیں کہتا۔ میں تو اپنا درد و غم چارہ سازِ حقیقی کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کیا تمہیں اتنا بھی گوارا نہیں!

(۱۲ ، ۸۶ — ۸۷) قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

باپ اس کے جواب میں کہتا کہ (میں تم لوگوں سے تو کچھ نہیں کہتا) میں تو اپنے غم و الم کا اظہار اپنے خدا کے سامنے کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (اس لیے میری امیدوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بیٹے مجھ سے ایک دن ضرور ملیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس انتظار کی مدت زیادہ طویل نہ ہو۔ لہٰذا) اے میرے بچو! تم ایک بار پھر جاؤ، یوسفؑ کا کچھ سراغ لگاؤ اور بن یامین کا حال احوال دریافت کرو۔ رحمتِ خداوندی کی نسیم جاں فزا سے کبھی مایوس نہ ہو۔ اس سے صرف وہ لوگ مایوس ہوتے ہیں جو اس کے اس قانون پر یقین نہیں رکھتے (کہ سعی و عمل اگر صحیح خطوط پر ہوں تو وہ کبھی بلا نتیجہ نہیں رہتے)۔

دیکھئے یہاں امیدوں کی دنیا کس طرح بیدار ہوتی نظر آرہی ہے۔ بیٹے غلّہ لینے کے لیے پھر مصر پہنچے۔ قحط زدگی سے ان کی حالت بڑی سقیم ہو چکی تھی۔ اس لیے بیع و شریٰ کے معاملہ کی بجائے حضرت یوسفؑ سے بھیک کے طلبگار ہوئے۔

(۱۲ ، ۸۸) فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا

اِنَّ اللّٰہَ یَجۡزِی الۡمُتَصَدِّقِیۡنَ ﴿۸۸﴾

(چنانچہ وہ پھر مصر گئے اور یوسفؑ سے کہا کہ) اے عزیز! ہم پر اور ہمارے گھرانے پر بڑی سختی کے دن آ گئے ہیں، (ہمارا منہ تو نہیں تھا کہ پھر آپ کے پاس آتے لیکن کیا کریں ہم سخت مجبور و لاچار ہوگئے ہیں۔ ہمارے پاس نہ غلہ رہا ہے اور نہ ہی غلہ خریدنے کے لیے پوری رقم ہے۔ بس) یہ حقیر سی پونجی ہے جسے لے کر ہم آگئے ہیں (اسے قبول کر لیجئے اور معاملہ خرید و فروخت کا نہ سمجھئے بلکہ) ہمیں بطور خیرات پورا غلہ دیجئے۔ اللہ خیرات کرنیوالوں کو نیک بدلہ دیتا ہے۔

ذرا غور کیجئے (عزیزِ مصر (حضرت یوسفؑ) کی عاجز نوازیوں کی شہرت کتنی عام تھی کہ اُن (اجنبیوں) نے اتنے وثوق سے کہہ دیا کہ ہماری بضاعت کی طرف نہ دیکھئے اپنے رحم و کرم کی طرف دیکھئے اور معاملہ خرید و فروخت کا نہ سمجھئے بلکہ صدقہ و خیرات کا خیال کیجئے۔ کیسا درد انگیز اور عبرت آموز تھا یہ منظر! یہ سنگ دل اور جفا کیش اس یوسفؑ سے بھیک کے سوالی ہیں جسے انہوں نے اس بے دردی سے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ یہ سُن کر حضرت یوسفؑ کا بھی جی بھر آیا اور اُنہوں نے کہا:

[۱۲/۸۹] قَالَ هَلۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا فَعَلۡتُمۡ بِیُوۡسُفَ وَ اَخِیۡهِ اِذۡ اَنۡتُمۡ جٰهِلُوۡنَ ﴿۸۹﴾

(یہ سُن کر یوسفؑ کا جی بھر آیا اور اب مزید توقف کی ضرورت نہ سمجھی۔ ان سے) کہا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے اپنی جہالت اور حماقت سے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ (۱۲/۸۹) کیا کیا تھا؟

اِذۡ اَنۡتُمۡ جٰهِلُوۡنَ ــ پر نگاہ ڈالیے۔ سیرتِ یوسفی کی زیبائیاں چھلک کر باہر آرہی ہیں۔ ایک یہ بھائی تھے کہ بن یامین تو ایک طرف، اس کے بھائی کے متعلق بھی چوری کا الزام لگانے سے نہ جھجکے۔ حتّٰی کہ بوڑھے باپ سے بھی طعن آمیز نشتر کے بغیر بات نہ کی۔ اور اُنہی کے بھائی حضرت یوسفؑ ہیں کہ ایسے شقی القلب بھائیوں کو ان کی شقاوتِ قلبی کی یاد دلائی تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم سے یہ کچھ نادانی اور جہالت سے ہو گیا تھا۔

سامنے حضرت یوسفؑ ہیں

حضرت یوسفؑ نے اپنی کشادہ نگہی سے الزام کی سختی کو اس قدر نرم کر دیا لیکن اس کے باوجود ذرا تصور میں لائیے کہ یہ معلوم کر کے کہ سامنے یوسفؑ

کھڑا ہے، بھائیوں کے قلب و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی؟ قرآنِ کریم نے اس اضطرابی کیفیت کو ایک عجیب انداز سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے کہ جب بھائیوں نے یوسفؑ کے مُنہ سے یہ الفاظ سُنے تو بوکھلاہٹ میں بول اُٹھے:

۱۲/۹۰ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ

ہیں! کیا تم یوسفؑ ہو؟ واقعی یوسف!

حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

اس نے کہا۔ ہاں! میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی (بن یامین) ہے۔ تم نے تو ہماری ہلاکت کے لیے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی، لیکن ہمارے خدا نے ہم پر بڑا کرم کیا — اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی غلط راہوں سے بچتا ہُوا، صحیح روش پر گامزن رہتاہے اور اس راستے پر جس قدر مشکلات آئیں، پامردی سے ان کا مُقابلہ کرتا ہے، تو وہ اس قسم کی حسن کارانہ زندگی بسر کرنے والوں کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جانے دیتا۔

غور کیجئے، لسانِ یوسفی نے دو لفظوں میں کتنی بڑی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ۔ جو کوئی زندگی کی تباہ کن رَوش سے بچتا اور قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے اور پھر ہجومِ مشکلات میں ثابت قدم رہتا ہے، اس پر اللہ کی نوازشات کی گہرباری ہوتی ہے۔ اُس اللہ کی جو مخلص انسانوں کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ اس کے بعد برادرانِ یوسفؑ پر جو کچھ گزری ہوگی اس کا اندازہ بیان میں نہیں، تصوّر ہی میں آسکتا ہے اُنہوں نے شرم و ندامت سے گردن جُھکالی اور کہا:

۱۲/۹۱ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ﴿۹۱﴾

(یہ سُن کر ان کے سر شرم اور ندامت سے جُھک گئے اور) انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم فی الواقعہ اللہ نے تمہیں ہم پر فضیلت دی ہے۔ اور ہم بڑے ہی خطاکار ہیں۔

غور فرمائیے۔ وہ بھائی جنہوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا تھا جو آج تک دُنیا میں بطورِ ضرب المثل مشہور[1]

[1] "برادرانِ یوسفؑ" ظلم و تعدی، فریب کاری اور کذب تراشی کے لیے ضرب المثل بن چکے ہیں۔

ہے. آج اُسی بھائی کے سامنے مجرموں کی حیثیت سے سر جھکائے کھڑے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ اُن سے پورا پورا انتقام لیا جاتا۔ لیکن جنہیں اللہ نے وسعتِ ظرف عطا فرمائی ہو' وہ ذاتی انتقام نہیں لیا کرتے۔ ان کی دوستی اور دشمنی عفو اور انتقام، اقدارِ خداوندی کے تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

۱۲/۹۲ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿٩٢﴾

یوسفؑ نے کہا۔ جاؤ! اب میں تم پر کوئی سرزنش نہیں کرتا۔ تم نے جو کچھ میرے خلاف کیا، میں اُسے معاف کرتا ہوں. (لیکن اس سے جو کچھ تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے اُس کو کون معاف کر سکتا ہے؟ اس کی معافی کی تو ایک ہی شکل ہے کہ) تم پھر سے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر کے خدا کی حفاظت میں آجاؤ۔ جرائم سے تمہاری ذات میں جو کمی واقع ہو گئی ہے وہ اسے پورا کر کے اس کی نشو و نما کر دے گا۔ وہ سب سے بہتر نشو و نما کرنے والا ہے۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ! جمالِ یوسفیؑ کا مہرِ عالم تاب نصف النہار پر نظر آرہا ہے۔ اس کے بعد آپ نے بھائیوں سے کہا کہ اب تم یوں کرو کہ:

۱۲/۹۳ اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلَىٰ وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٣﴾

(واپس گھر جاؤ اور) یہ میری قمیص اپنے ساتھ لے جاؤ (جو میری وجاہت اور منصب کی محسوس نشانی ہے) جب تم اسے اباجان کے سامنے پیش کرو گے تو وہ ساری بات سمجھ جائیں گے' اور جو کچھ تم کہو گے اس کا یقین کر لیں گے۔ پھر تم اپنے تمام اہلِ خاندان کو لے کر یہاں آجانا۔

پیراہنِ یوسفیؑ

یہی بھائی اس سے پیشتر باپ کے پاس ایک کرتہ لائے تھے جسے دیکھ کر روتے روتے باپ کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ آج وہی بھائی اُسی یوسفؑ کا ایک اور کُرتہ لے کر اُسی باپ کے پاس جاتے ہیں جس کُرتے سے بوڑھے باپ کی متاعِ گم گشتہ واپس مل رہی ہے۔ قافلہ مصر سے روانہ ہوا اور مختلف منازل طے کرتا اس بستی کے قریب آپہنچا جہاں حضرت یعقوبؑ اور اُن کا گھرانہ آباد تھا۔ یہاں سے باقی قافلہ آگے چلا گیا اور برادرانِ یوسفؑ کے اونٹ الگ ہو گئے (وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ)

قافلہ کی آمد کا چرچا عام ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ قافلہ کا انتظار کس شدت سے کر رہے ہوں گے۔ ایسا انتظار کہ دل کی ساری حسرتیں سمٹ کر آنکھ کے تِل میں آگئی ہوں گی۔ اِن کے دل اور دماغ کی تمام قوتیں ایک نقطہ پر مرتکز ہو چکی ہوں گی۔

شمیمِ یوسفی کی عطر بیزیاں

قرآن کریم نے حضرت یعقوبؑ کی وجد و مسرت کی اس والہانہ کیفیت کو عجب دلآویز پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

۱۲/۹۴ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ اَبُوهُمْ اِنِّي لَاَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿۹۴﴾

جب یوسفؑ کے بھائیوں کا قافلہ روانہ ہوا تو یعقوبؑ نے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ اگر تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ بڑھاپے کی وجہ سے میری عقل ماری گئی ہے تو مجھے یوسفؑ اور اس کی عظمت و اقتدار کی مہک آ رہی ہے۔

سُننے والوں کی نگاہیں بھلا وہ کچھ کب دیکھ سکتی تھیں جو قلبِ یعقوبؑ کو محسوس اور دیدۂ یعقوبؑ کو نظر آ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اب وحی کی طرف سے بھی کچھ اشارہ مل گیا ہو جیسا کہ (۱۲/۹۶) سے مترشح ہوتا ہے۔ لیکن سُننے والے اسے (معاذ اللہ) خبط ہی کہتے تھے۔

۱۲/۹۵ قَالُوا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيمِ ﴿۹۵﴾

سُننے والوں نے کہا کہ بخدا! تم ابھی تک اپنے اُس پُرانے خبط میں مبتلا ہو۔ (یوسفؑ کا نام و نشان تک بھی گم ہو چکا ہے اور تمہیں اُس کی عظمت و اقتدار کی مہک آ رہی ہے!)

اتنے میں وہ بیٹا جس کے پاس کُرتہ تھا، اس مژدۂ جانفزا کو لے کر حضرت یعقوبؑ کے پاس آ پہنچا۔

۱۲/۹۶ فَلَمَّا اَنْ جَآءَ الْبَشِيرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّي اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۹۶﴾

چنانچہ وہ قافلہ کنعان پہنچ گیا اور خوش خبری دینے والے نے یوسفؑ کا کُرتہ یعقوب کے سامنے پیش کیا تو اُسے یقین آ گیا (کہ فی الواقعہ یوسفؑ زندہ بھی ہے اور اس قدر شان و شوکت کا مالک بھی) اس نے لوگوں سے

کہا کہ کیا میں تم سے نہیں کہا کرتا تھا کہ مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم دیا گیا ہے جو تمہیں نہیں دیا گیا۔

اس مقام پر کہا اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس میں وحی کا اشارہ بھی شامل تھا، اگرچہ ایک نبی کی ذاتی فراست و بصیرت بھی کچھ کم حقیقت آشنا نہیں ہوتی۔ باپ کی اس کیفیت کے ساتھ بیٹوں کی حالت کا بھی اندازہ لگائیے۔ باپ کے سامنے اُن کی نگاہیں اُوپر کو نہیں اُٹھ سکتی تھیں۔ اُنہوں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا:

۱۲/۹۷ قَالُوْا یٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا کُنَّا خٰطِئِیْنَ ﴿۹۷﴾

بیٹوں نے باپ سے کہا کہ ہم بڑے خطاوار ہیں۔ (ہم اس قابل تو نہیں کہ ہمیں معاف کیا جائے لیکن ہماری پھر بھی آپ سے درخواست ہے کہ) آپ ہمارے لیے معافی طلب کریں۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا:

۱۲/۹۸ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّیْ ؕ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۹۸﴾

یعقوبؑ نے کہا: میں تمہارے لیے اپنے ربّ سے سامانِ حفاظت طلب کروں گا۔ اس لیے کہ اس کے قانونِ مکافات میں (جرائم سے تائب ہو جانے والوں کے لیے) حفاظت و مرحمت کی گنجائش ہے۔

اس کے بعد یہ تمام گھرانا شاداں و فرحاں جانبِ مصر روانہ ہوا۔ حضرت یوسفؑ نے شہر[1] سے باہر اُن کا استقبال کیا۔

۱۲/۹۹ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰٓی اِلَیْہِ اَبَوَیْہِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

جب وہ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اُس نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس ٹھہرایا اور باقی اہلِ خاندان سے بھی کہا کہ اب تم مصر میں، اِن شاء اللہ، آرام سے رہو گے (یعنی چونکہ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو رہا ہے اس لیے تم آرام سے رہو گے۔ امن مشروط ہے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے)۔

عزّت و تکریم کی مسندیں

حضرت یوسفؑ نے جشنِ مسرت کے طور پر دربار منعقد کیا۔ ماں باپ کیلئے مسند بچھائی۔ اہلِ دربار تعظیم بجالائے۔ عزت و وقار اور عظمت و اجلال کا

---

[1] اس زمانہ میں مصر کا دارالحکومت (عمسیس) تھا اور اُسے جشن کا شہر کہتے تھے۔

یہ وہ منظر تھا جسے آج سے بہت عرصہ پہلے حضرت یوسفؑ نے اپنے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ آج یوں پورا ہوا:

۱۲/۱۰۰ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۖ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۖ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۚ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ۚ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

اُس نے اپنے ماں باپ کو عزت و تکریم کی بلند مسندوں پر بٹھایا اور تمام متعلقین، اہلِ کار اور خدام یوسفؑ کی وجہ سے ان کی تعظیم بجالائے۔

اُس وقت یوسفؑ نے کہا۔ ابا جان! یہ ہے میرے اُس خواب کی تعبیر جو میں نے اتنا عرصہ پہلے دیکھا تھا۔ میرے نشو و نما دینے والے نے خواب کو حقیقت بنا کر دکھا دیا۔ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکال کر (اس مقامِ بلند تک پہنچا دیا) اور مخالفت کی اس خلیج کو پاٹ کر، جو شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان حائل کر دی تھی، آپ سب کو صحرا سے یہاں منتقل کر دیا (کہ سب عزت اور آرام کی زندگی بسر کریں)۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا نشو و نما دینے والا، اپنی اسکیموں کو بڑے ہی لطیف انداز سے بروئے کار لاتا اور تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اس کی ہر بات علم و حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔

ان نوازشاتِ بے پایاں کے احساس سے حضرت یوسفؑ کی گردن اس محسنِ حقیقی کے حضور جھک گئی جس کی ذرہ نوازیوں کے صدقے یہ سب کچھ دیکھنے میں آیا تھا اور اس کی بارگاہ میں عرض کیا:

۱۲/۱۰۱ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

(ان تمام گزشتہ واقعات کی یاد سے یوسفؑ کے دل میں تشکر و امتنان کے جذبات موجزن ہو گئے۔ اور

اس نے بحضور ربّ العزت عرض کیا کہ) اے میرے نشو ونما دینے والے! تیرا کتنا احسان ہے کہ تو نے مجھے اس قدر اختیارات واقتدارات کا مالک بنا دیا۔ مجھے تدبیرِ امور اور عاقبت اندیشی کا علم وسلیقہ عطا فرما دیا۔
اے کائنات کے پیدا کرنے والے! تو ہی حال اور مستقبل، دنیا اور آخرت، میں میرا کارساز ورفیق ہے۔
مجھے توفیق عطا فرما کہ میری ساری زندگی تیرے قوانین کی اطاعت میں گزرے اور میرا شمار اُن نیک بخت لوگوں میں ہو جن کے سب کام سنور گئے ہوں!
غور فرمائیے۔ دنیا کی حکومت اور شوکت کے ساتھ ساتھ دعا کیا مانگی جارہی ہے؟ یہ کہ جب دنیا سے جاؤں تو ایک عبدِ مُسلم کی حیثیت سے جاؤں اور عاقبت میں تیرے صالح بندوں کے زمرہ میں شریک ہوں! یہ ہے ایک عبدِ مومن کی دین ودنیا کی آرزوؤں کا منتہیٰ! کیسا خوش بخت ہے وہ انسان اور کیسی طالعمند ہے وہ قوم جس کو وہ مبداءِ فیض، دین ودنیا کی سرفرازیاں عطا فرما دے۔ لیکن یہ سب کچھ عطا ہوتا ہے ایمان وعملِ صالح کے نتیجہ میں، نہ کہ صرف خاص قسم کے نام رکھ لینے اور رسمی دعائیں مانگ لینے سے!



یہ ہے حسنِ عمل کی وہ سرگزشتِ زریں جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور نبی اکرمؐ پر نازل فرمایا:

(۱۲ / ۱۰۲—۱۰۴) ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

اے رسولؐ! یہ وہ تاریخی سرگزشتیں ہیں جو تیرے علم میں نہیں تھیں اور جنہیں ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے بتایا ہے۔
— تم برادرانِ یوسفؑ کے پاس کھڑے نہیں تھے جب وہ اپنی سازش پر متفق ہو گئے تھے اور وہ یوسفؑ کے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے۔ (اس لیے تمہیں اِن واقعات کا علم کیسے ہو سکتا تھا)۔
(تمہارے رسولؐ ہونے کی یہ بھی ایک واضح شہادت ہے، لیکن اس کے باوجود) بہت سے لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے خواہ تم کتنا ہی کیوں نہ چاہو۔

حالانکہ تو ان سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں مانگتا۔ بلا مُزد و معاوضہ ان کی بھلائی کے لیے اس قدر کوشش کر رہا ہے۔

یہ داستانِ شیریں ختم ہوگئی۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے اس کے چند ایک اہم مقامات پر نگہ بازگشت کی ضرورت ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو "تاویل الاحادیث" کا علم عطا فرمایا تھا۔ چونکہ حضرت یوسفؑ

تَاوِیْلُ الْاَحَادِیْثِ

نے خوابوں کی تعبیر بتائی تھی اس لیے عام طور سے سمجھ لیا گیا کہ تاویل الاحادیث سے مراد خوابوں کی تعبیر کا علم ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائیگا۔ خوابوں کی تعبیر کا علم بھی تاویل الاحادیث کے اندر شامل ہو سکتا ہے۔ لیکن تاویل الاحادیث سے مراد فقط تعبیر علم المنام نہیں۔ تاویل کے معنی نتیجہ اور مآلِ کار کے بھی ہیں اور احادیث کے معنی ہیں باتیں۔ لہٰذا تاویل الاحادیث کے معنی ہوئے کسی بات سے یہ معلوم کر لینا کہ اس بات کا صحیح صحیح مطلب کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کو معاملہ فہمی کہتے ہیں۔ یعنی کوئی معاملہ سامنے آئے، اُس کے سیاق و سباق اور متعلقات و تضمنات پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچ جانا کہ اس کا مآل و انجام کیا ہوگا؟ غور کیجئے۔ دُنیا میں ایک عام انسان اور ایک صاحبِ تدبّر و فراست میں کیا فرق ہوتا ہے؟ معاملات و واقعات ہر ایک کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ ایک عام ذہنی سطح کا انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ لیکن ایک دیدہ ور کی نگاہیں ہواؤں کے رُخ سے طوفان کی آمد کا اندازہ کر لیتی ہیں۔ قوموں کی زندگی، ان کے مفکرین کی دیدہ وری اور مآل اندیشی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ وہ مفکرین جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت
سخن نازک تر از برگِ سمن گفت
ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت (اقبالؒ)

حضرت یوسفؑ کنعان کے گلہ بانوں کے ایک قبیلہ میں پیدا ہوئے۔ ہر چند قبیلہ کی سرداری ان کے گھرانے میں تھی، لیکن ظاہر ہے کہ انہیں وہاں حضریت کی سیاستِ مُدن اور عمرانیات و معاشیات کے مہمات و معاملات سے متعلق نہ کوئی تعلیم مل سکتی تھی، نہ تربیت کے سامان موجود تھے۔ بدوی اور حضری زندگی کا فرق چھپا ہوا نہیں۔ اس لیے اس قسم کا ایک دہقانی بچہ جب ایک غلام کی حیثیت سے شہر میں آئے تو اس کی زندگی ایک غلام (گھر کے ملازم) سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک طرف بلند پایہ فراست عطا فرمائی اور اس کے ساتھ ایسے مواقع بہم پہنچائے

جن میں آپ نے عملی طور پر اہم معاملات کے نظم و نسق کا سلیقہ سیکھ لیا[1]. یعنی عزیز مصر نے آپ کو اپنے کاروبار کا مختار اور معتمد علیہ بنا لیا اور اس طرح آپ کو ان امور کا عملی تجربہ ہو گیا جو تمدنی زندگی کی خصوصیات میں سے تھے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشیّت کی طرف سے اس کا انتظام اس لیے کیا گیا تھا کہ یوسفؑ کو "تاویل الاحادیث" کا علم سکھا دیا جائے۔ خوابوں کی تعبیر کا علم سکھانے کے لیے تمکن فی الارض کی ضرورت نہیں تھی۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ز وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۔ (۱۲/۲۱)

اس طرح ہم نے سرزمینِ مصر میں یوسفؑ کے پاؤں جما دیئے اور ایسا انتظام کر دیا کہ اس کی اچھی طرح سے تعلیم و تربیت ہو جائے اور اس میں معاملہ فہمی اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اللہ اپنی اسکیموں کو کامیاب بنا کر رہتا ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہو رہا ہے)۔

اسی خداداد فراست اور عملی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت یوسفؑ کو حکومت و مملکت کے اختیارات تفویض کیے گئے تو آپ نے اس حسنِ تدبّر سے ان امور کا انتظام کیا کہ سب کی گردنیں آپ کے سامنے جھک گئیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے مملکت عطا فرمائی اور اس کے ساتھ "تاویل الاحادیث" کا علم بھی دے دیا۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۱)

(ان تمام گزشتہ واقعات کی یاد سے، یوسفؑ کے دل میں تشکّر و امتنان کے جذبات موجزن ہو گئے، اور اس نے بحضور رب العزّت عرض کیا کہ) اے میرے نشو و نما دینے والے! تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ تُو نے مجھے اس قدر اختیارات و اقتدارات کا مالک بنا دیا۔ مجھے تدبیرِ امور اور عاقبت اندیشی کا علم و سلیقہ عطا فرما دیا۔

اے کائنات کے پیدا کرنے والے! تو ہی حال اور مستقبل، دنیا اور آخرت میں میرا کارساز و رفیق ہے، مجھے توفیق عطا فرما کہ میری ساری زندگی تیرے قوانین کی اطاعت میں گزرے اور میرا شمار اُن خوش بخت لوگوں میں ہو جن کے سب کام سنور گئے ہوں — !

---

[1] اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو بھی بچپن ہی میں فرعون کے محلات میں پہنچا دیا گیا تھا تاکہ وہ وہاں کی اس داخلی سیاست کا مشاہدہ کر سکیں جس سے اُنہوں نے بعد میں دوچار ہونا تھا۔

ان مقامات سے تاویل الاحادیث کا مفہوم واضح ہے یعنی پیش نظر احوال و کوائف سے استنباطِ نتائج کی صلاحیت۔
کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت

۲۔ خوابوں کی دُنیا

قصۂ حضرت یوسفؑ میں خوابوں کے تذکرہ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ خواب کی حقیقت کیا ہے؟ یہ مسئلہ اُس وقت سے اربابِ فکر و نظر کی توجہات کا مرکز بنا چلا آرہا ہے جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا۔ عصرِ حاضر میں تجزیۂ نفس کے ماہرین (بالخصوص فرائڈ اور اس کے مکتبِ فکر) نے اس مسئلہ کو خاص طور پر اپنے غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کا موضوع بنایا ہے جن کی عملی کاوشوں کی بنا پر اس چیستان کے کئی ایک گوشوں پر روشنی پڑچکی ہے۔ چونکہ یہ علم ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں ہے اس لیے یہ روشنی ابھی دھندلی سی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس موضوع کے کچھ نہ کچھ خط و خال سامنے ضرور آچکے ہیں۔ اس علم کی رُو سے انسان میں نفسِ شعوریہ (CONSCIOUS MIND) کے علاوہ نفسِ غیر شعوریہ (UNCONSCIOUS MIND) بھی[۱] ہے۔ انسانی زندگی میں بہت سے احوال و کوائف ایسے ہوتے ہیں جنہیں نفسِ شعوریہ کچھ وقت تک یاد رکھتا ہے لیکن اس کے بعد یا تو ان واقعات کو یکسر بھلا دیتا ہے یا ان کے خصوصی احساسات اور تاثرات کے نقوش اپنی لوح سے محو کر دیتا ہے۔ لیکن نفسِ غیر شعوریہ ان واقعات کے اہم حصص اور ان کے خصوصی تأثرات کو اپنی گرہ میں باندھ کر رکھ لیتا ہے۔ یہ تأثرات نفسِ شعوریہ کے ساتھ متصادم ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح انسان کے نظامِ عصبی کو غیر محسوس طور پر متأثر کرتے رہتے ہیں۔ ان سے اس قسم کے عوارضات لاحق ہو جاتے ہیں جن کا کوئی طبعی سبب (PHYSICAL CAUSE) سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ حصہ ایک جداگانہ بحث سے تعلق رکھتا ہے۔ مبحث زیرِ نظر کے لیے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ نفسِ نیم یا غیر شعوریہ اس وقت اپنا عمل شروع کرتا ہے جب نفسِ شعوریہ کی فعالیت (ACTIVITY) معطل ہوتی ہے (مثلاً حالتِ نشہ میں یا ملکے سے غش یا ہسٹریا وغیرہ کے دورے میں)، لیکن نفسِ غیر شعوریہ کو اپنی کارفرمائی کے لیے ان ہنگامی مواقع سے بھی زیادہ فرصت کا زمانہ اس وقت ملتا ہے جب انسان سو رہا ہو۔ اس وقت نفسِ شعوریہ کی حرکت معطل ہوتی ہے اور نظامِ جسمانی میں کسی قسم کا انتشار و اضطراب بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے نفسِ نیم یا غیر شعوری اپنے "جادو" کے البم کو کھولتا ہے اور پھر بھولے ہوئے افسانوں کی مختلف

---

[۱] نفسِ انسانی سے متعلق بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔ انڈکس دیکھئے۔

تصویریں ذہن کے پردۂ سیمیں پر لاتا ہے۔ واقعات میں ترتیب اور ان کے نتائج و عواقب میں ربط وضبط نفسِ شعوریہ کا منصب ہے۔ اس لیے نیم یا غیر شعوریہ نفس جن تأثرات یا واقعات کے ٹکڑے سامنے لاتا ہے، ان میں کوئی باہمی ربط یا ترتیب نہیں ہوتی۔ بنا بریں، اس کی پیش کردہ فلم عجب بے ربطی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ (اگرچہ بعض اوقات ایسے ٹکڑے بھی سامنے آجاتے ہیں جو اچھے خاصے مربوط ہوتے ہیں) اسی کا نام خواب ہے۔ ان تأثرات میں جنہیں نفسِ شعوریہ بھلا دیتا ہے اور نفسِ نیم یا غیر شعوریہ اپنے اسٹور میں جمع رکھتا ہے، ہزاروں خوں گشتہ آرزوئیں، سینکڑوں پامال شدہ تمنائیں، بیسیوں ایسی للچائی ہوئی نگاہیں جو حسرت بن کر دل کی گہرائیوں میں جا چھپی ہوں، خوابیدہ ہوتی ہیں۔ جب نفسِ شعوریہ کی دُنیا سوتی ہے تو یہ خوابیدہ حسرتیں جاگ اُٹھتی ہیں۔ لیکن بے ربطیٔ مضمون سے طلسم ہوشربا کا سا افسانہ بن کر سامنے آتی ہیں اور جب نفسِ شعوریہ کی آنکھ کھلتی ہے تو اس افسانے کے بعض ٹکڑے کسی بھُولے ہُوئے واقعہ کی دھندلی سی یادیوں تازہ کرا دیتے ہیں جیسے مرمریں گردیں ڈوبی ہوئی وادیٔ کہسار کے اُس پار، رات کے سناٹے میں دُور سے بنسری کی آواز دل کے نرم و نازک گوشوں میں میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر خواب کا افسانہ، اس کی بے ربطی ہی کی نذر ہو جاتا ہے۔ علمِ تجزیۂ نفس کے ماہرین، خوابوں کے ان بے ربط ٹکڑوں سے نفسِ نیم یا غیر شعوریہ کی تہ میں چھپے ہُوئے رازوں کی ٹوہ[1] لگاتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں بڑی صبر آزما محنت کرنا پڑتی ہے۔ وہ خواب دیکھنے والے کی سابقہ زندگی کے احوال و کوائف معلوم کرتے ہیں۔ وہ ان نیم کشش تیروں کی اَنیاں تلاش کرتے ہیں جو دل کے اندر ٹوٹ کر رہ گئی ہوں۔ وہ ایسی پھانسوں کی ٹوہ لگاتے ہیں جو رگِ جاں میں ڈوب کر پھر نہ اُبھری ہوں۔ اس طرح وہ خواب دیکھنے والے کے خیالات کی رَو اور ذہن کی افتاد کا مطالعہ کرتے ہیں، اور اس سے بعض اہم نتائج پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ قیاسی ہوتا ہے، حتمی طور پر وہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتے — بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ محقق اپنے قیاسات سے خواب کے معاملات کو آنے والے واقعات سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ مستقبل کے واقعات خواب یا اس کی تعبیر کے مطابق نکل آتے ہیں لیکن یہ محض اتفاقی امور ہیں۔ انہیں حقائق سے کچھ واسطہ نہیں۔ مثلاً ہوتا کیا ہے؟ آپ کی شدید تمنا ہے کہ آپ کا مستقبل فلاں سانچے

---

[1] بیداری کے وقت جو کچھ خواب کے متعلق یاد رہتا ہے وہ سب کچھ وہی نہیں ہوتا جو نفسِ غیر شعوریہ حالتِ خواب میں سامنے لاتا ہے۔ جو کچھ خواب میں سامنے آتا ہے، علمِ تجزیۂ نفس کی رُو سے اُسے (LATENT CONTENT) کہا جاتا ہے اور حالتِ بیداری میں جو کچھ یاد رہتا ہے اُسے (MANIFEST CONTENT) کہتے ہیں۔ اس (MANIFEST CONTENT) سے (LATENT CONTENT) کا سراغ لگانا خواب کی تعبیر کہلاتا ہے۔

میں ڈھلے لیکن حالات اور واقعات آپ کو اس طرف جانے نہیں دیتے۔ آپ کا نفسِ شعور یہ حالات اور واقعات کے مطابق کام کرتا ہے لیکن جونہی آپ سوتے ہیں، نفسِ نیم یا غیر شعور یہ آپ کی تمنا کی سوئی ہوئی دنیا کو بیدار کر دیتا ہے اور وہ ایک حسین خواب کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جب آپ جاگتے ہیں تو پھر اپنے احوال وظروف کے مُطابق مصروفِ کار ہو جاتے ہیں۔ اب آخر میں دو صورتوں میں سے ایک صورت پیدا ہوگی۔ یا تو آپ کا مستقبل آپ کی آرزوؤں کے خلاف عام احوال وظروف کے قالب میں ڈھل جائے گا۔ اس صورت میں آپ کے خواب جو آپ کے مستقبل کو آپ کی تمنّاؤں کے رنگ میں پیش کیا کرتے تھے، محض واہمہ بن کر رہ جائیں گے۔ لیکن اگر ایسا ہو گیا کہ آپ نے احوال وظروف کے علی الرغم، اپنے مستقبل کو اپنی خواہشات کے مطابق متشکل کر لیا تو اُس صورت میں آپ کے خواب "حرف بحرف سچ ہو کر" سامنے آجائیں گے۔ اس وقت آپ کہہ اُٹھیں گے کہ مجھے پہلے ہی خواب میں اشارہ ہو گیا تھا کہ میرا مستقبل کیا بننے والا ہے۔ اس طرح آپ کے خواب "پیش گوئی" (PROPHETIC) ہو جائیں گے۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس پر دیگر واقعات کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) بہت سی باتیں تو اتفاقی امور (COINCIDENCE) سے متعلق ہوتی ہیں۔

یہ ہے خواب کی حقیقت جو اس وقت تک کی علمی تحقیق کی رُو سے سامنے آئی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، علمِ تجزیۂ نفس اور اس کے تضمنات ہنوز اپنے ابتدائی مراحل میں ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ اس وقت تک سامنے آیا ہے، وہی حقیقت ہے۔

لیکن بہر کیف علمی تحقیقات کی رُو سے، جو کچھ سامنے آیا ہے وہ یہی ہے۔ اس تحقیق کی رُو سے، خواب انسان کے اپنے ہی گم گشتہ خیالات وتصوّرات اور دبی ہوئی تمنّاؤں اور آرزوؤں کی صدائے بازگشت ہوتے ہیں۔ انہیں کسی اور دنیا سے تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے جس قسم کے خیالات وتصوّرات ہوں گے اُسی قسم کے خوابوں کی دنیا ہوگی۔ جن لوگوں کے خیالات وتصوّرات اور تمنائیں اور مقاصد کثافتوں سے پاکیزہ ہوں گے، اُن کے خواب بھی آئینے کی طرح مصفّٰی ہوں گے۔ جن کے فکر ونظر کی تطہیر ہو چکی ہوگی ان کے خوابوں کی دنیا میں بھی کوثر وسلسبیل کی آبشاریں نغمہ بار ہوں گی۔ حضرات انبیاء کرامؑ خیالات وتصوّرات کی پاکیزگی ورفعت میں انسانی امکان کی بلند ترین سطح پر ہوتے تھے، اس لیے جیسی ان کے قلب ونگاہ کی دنیا، ویسے ان کے خواب!

اب رہا خواب کی تعبیر کا سوال، سو جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس کا تعلق انسانی فراست سے ہے۔ جو مختلف احوال وظروف کی روشنی میں قیاساً کسی نتیجہ پر پہنچا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعبیرات محض ظنّی اور قیاسی ہوتی

ہیں۔ اس میں نبی اور غیر نبی کا فرق نہیں ہوتا۔ کیونکہ نبی بھی اس باب میں جو کچھ کہے گا وہ اس کی ذاتی (بشری) فراست پر مبنی ہوگا۔ وحی پر مبنی نہیں ہوگا۔[1]

اس تمہید کو سامنے رکھ کر قصۂ حضرت یوسفؑ کے خوابوں پر غور کیجئے۔ پہلا خواب خود حضرت یوسفؑ کا ہے۔ ہر چند وہ ان کے (قریب قریب) بچپن کا زمانہ ہے، لیکن خانوادۂ نبوّت کا چشم و چراغ اور خود بھی ہونے والا نبی۔ اس لیے آپ کا خواب بھی انہی بلند خیالات کا آئینہ دار تھا، جن کی آماجگاہ آپ کا قلب و دماغ تھا۔ شمس و قمر اور روشن ستارے سجدہ ریز! یہ تھا خواب، اور اس کی تعبیر بتانے والے حضرت یعقوبؑ، جنہیں بیٹے کا طالع بلند اس کی سیرت کی پیشانی میں درخشاں نظر آرہا تھا۔

دوسرا خواب قید خانہ کے ساتھیوں کا تھا۔ اس کی تعبیر کے سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ کچھ وقت تک ساتھ رہنے سے فراستِ یوسفی نے بھانپ لیا ہوگا کہ ان میں ایک بے گناہ ہے اور دوسرا واقعی مُجرم۔ خود اُن کے خیالات کی رَو کا پہچان لینا بھی مشکل نہ تھا، اس لیے ان کے خوابوں کی تعبیر چنداں دشوار نہ تھی۔ یہ درحقیقت آپ کی صلاحیت تاویل الاحادیث ہی کا ایک مظاہرہ تھا۔ یعنی اس میں معاملہ فہمی کو زیادہ دخل تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک طرف قرآن نے اس تعبیر کا ذکر ایسے انداز میں کیا ہے جس سے سوچ کا رُخ اس طرف جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علم آپ کو بذریعہ وحی عطا کر دیا تھا۔ آپ نے تعبیر بتانے کے بعد فرمایا۔ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ (۱۲/۴۱) جس بات کے بارے میں تم سوال کرتے ہو وہ فیصل ہو چکی ہے۔ اور فیصلہ وہ ہے جو میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ دوسری طرف قرآن نے اگلی آیت میں کہا ہے۔ وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا (۱۲/۴۲) ان میں سے جس کے متعلق اس نے اندازہ لگایا تھا (ظَنَّ) کہ وہ چھوٹ جائے گا، اس سے کہا .... ” یہاں کہا گیا ہے کہ خواب کی یہ تعبیر حضرت یوسفؑ کا ظن تھی۔ ظن کے معنی کے متعلق امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ کسی چیز کی علامات سے انسان جس نتیجہ پر پہنچے، اُسے ظن کہتے ہیں اور یہ صرف قیاس اور اندازہ ہوتا ہے، یقینی بات نہیں ہوتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تعبیر آپ کی اپنی فراست کا نتیجہ تھی۔ وحی کی صورت میں اسے ظن نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وحی تو یقین ہوتا ہے بلکہ یقین کی بھی

---

[1] بعض اوقات طبیعت کے اثر سے بھی خواب مرتب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سوتے میں پیاس لگے تو انسان خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ آگ میں جُھلس رہا ہے، یا پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑا ہے۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ پیاس سے اُس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ اس قسم کے خواب محض مزاج کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں جنہیں اضغاثُ احلام" (پریشان خیالی) کہا جاتا ہے۔ یہ طب کی دنیا سے متعلق ہے۔

انتہائی شکل۔

تیسرا خواب بادشاہ کا ہے۔ حضرت (یوسفؑ) جیسے دیدہ ور صاحبِ فراست کے لیے، جو اس ملک کے حالات کا یقیناً گہری نظر سے مشاہدہ اور مطالعہ کر رہے ہوں گے، یہ اندازہ لگا لینا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ ملک کی زرعی معیشت کس طرف جا رہی ہے۔ اس کا آئینہ دار بادشاہ کا خواب تھا۔ اس میں قرآنِ کریم نے یہ نہیں کہا کہ اس کی تعبیر اور تدبیر کی بنیاد وحی کا علم تھا۔



یہاں تک داستانِ حضرت یوسفؑ سے متعلق خوابوں کا ذکر تھا لیکن قرآنِ کریم میں دو اور اہم خوابوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ برمحل ہو گا اگر ان کا ذکر بھی اس مقام پر کر دیا جائے۔ ان میں ایک خواب ذبحِ حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق) حضرت ابراہیمؑ کا ہے اور دوسرا خواب (صلح حدیبیہ کے متعلق) نبی اکرمؐ کا۔

حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں ذبح کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسے خدا کے حکم پر محمول کر لیا اور بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس مقام پر خود خدا نے ان سے کہا کہ یہ تو محض تمہارا خواب تھا جسے تم نے حقیقت سمجھ لیا۔ یہ خدا کا حکم نہیں تھا۔ تفصیل اس کی مطالبُ الفرقان جلد سوم صفحہ ۲۵ میں گزر چکی ہے۔

دوسرا خواب نبی اکرمؐ کا صلح حدیبیہ سے متعلق تھا۔ آپ ہجرت فرما کر مکہ سے مدینہ تشریف لے آئے۔ یہاں آپ کے مشن کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن چونکہ نظامِ خداوندی کا مرکز کعبہ تھا، اس لیے اس کی تولیت کی آرزو آپ کے دل میں بڑی شدت سے بیتاب رہتی تھی۔ انڈکس میں آپ قبلہ کا عنوان دیکھئے۔ یہ حقیقت واضح طور پر آپ کے سامنے آجائے گی۔ اسی شدتِ آرزو کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ۶ھ میں خواب میں دیکھا کہ آپ مع صحابہؓ مکہ میں داخل ہو کر کعبہ کا طواف کر رہے ہیں۔

اس وقت تک مسلمانوں پر حج فرض نہیں ہوا تھا، لیکن زمانہ قبل از اسلام میں عرب حج بھی کیا کرتے تھے۔ اور عُمرہ بھی — چنانچہ آپ نے اپنے خواب کی بنا پر عمرہ کے ارادے سے مکہ کا قصد فرمالیا اور شدتِ شوق میں صحابہؓ کی قریب ڈیڑھ ہزار کی جماعت آپ کے ہم رکاب ہو گئی۔ ابھی آپ مکہ سے ایک منزل دور حدیبیہ کے مقام پر تھے کہ قریش نے پیغام بھیج دیا کہ وہ آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، آپ اگلے سال آئیے۔ چنانچہ اس کے مطابق قریش کے ساتھ معاہدہ بھی ہو گیا اور حضورؐ مدینہ واپس تشریف لے گئے۔ اس سے صحابہؓ کے دل میں

کھٹک پیدا ہوئی کہ جب آپ نے اپنے خواب کی بنا پر یہ عزم فرمایا تھا تو پھر اس میں کامیابی کیوں نہ ہوئی (روایت میں یہ بھی ہے کہ) حضرت عمرؓ نے آپ سے براہِ راست دریافت کیا کہ کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم کعبہ کا طواف کریں گے۔ آپ نے فرمایا "لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس سال کریں گے۔" (سیرت النبی شبلی نعمانی۔ حصہ اول ص ۴۷۲) قریش نے آپ کے خواب اور اس ناکامی کا (معاذ اللہ) مضحکہ اڑایا۔ قرآن کے الفاظ میں وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (۱۷/۶۰) یہ خواب لوگوں کے لیے فتنہ کا موجب بن گیا۔ دو سال بعد جب مکہ فتح ہوا اور حضورؐ فاتح و منصور اس میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ۔ (۴۸/۲۷) خدا نے رسولؐ کا خواب سچ کر دکھایا" ہم نے اس مقام پر ان واقعات کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا۔ کیونکہ اس وقت زیرِ بحث صرف خوابوں کا ذکر ہے۔ (ان موضوعات تفصیلات اپنے مقام پر آئیں گی۔)

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ:

۱۔ حضورؐ کا خواب اس شدتِ آرزو کا آئینہ دار تھا جو تولیتِ کعبہ کے لیے آپ کے دل میں موجزن رہتی تھی۔

۲۔ اس خواب کی بنا پر آپ نے عمرہ کا عزم بھی کر لیا لیکن وہ ناکام رہا۔

۳۔ خواب کی تعبیر میں آپ سے اجتہادی غلطی ہوئی جو آپ نے (حضرت عمرؓ کے سوال کے جواب میں) فرمایا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم اسی سال مکہ میں داخل ہوں گے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ رسولؐ اللہ کے خواب میں بھی وحی کا دخل نہیں تھا۔



جو کچھ سابقہ صفحات میں لکھا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ خواب انسان کے اپنے ہی خیالات و تصورات کا پریشان سا عکس ہوتے ہیں۔ کسی اور دنیا سے ان کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا، خوابوں کی دنیا کو ایک مستقل عالم قرار دے کر اس پر حقائق کی بنیاد رکھ دینا، افسانہ طرازی سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقائق کا تعلق علم سے ہے۔ عام انسان کسب و ہنر سے علم حاصل کرتا ہے جو یقینی بھی ہوتا ہے اور ظنی بھی۔ یکسر یقینی علم وحی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے۔ خوابوں کا ان دونوں اقسام کے علم سے تعلق نہیں ہوتا۔ نہ کسی کا خواب کسی دوسرے (یا خود خواب دیکھنے والے) کے لیے حُجت ہو سکتا ہے اور نہ اس کی تعبیر کوئی خدائی سند اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ لیکن حقائق سے منہ موڑ لینے کے مسلمانوں کے ہاں جس طرح اوہام پرستی کے سینکڑوں اور دروازے کھُل گئے، ان میں خوابوں کی توہم پرستی بھی

شامل ہوگئی کہ فلاں بزرگ خواب میں آکر یہ ارشاد فرما گئے ہیں۔ اب اس کی تعمیل آیتِ خداوندی سے بھی زیادہ مقدّم ہے۔ مقدّم ہی نہیں بلکہ اگر ان کا وہ ارشاد حکمِ شریعت کے صریحاً خلاف بھی جاتا ہے تو بھی یہ کہہ کر اس کو ترجیح دی جاتی ہے کہ شریعت ظواہر پرستی ہے اور وہ بزرگ حقیقت شناس ہیں۔ اس لیے ان کے ارشاد میں ایک ایسا راز پنہاں ہے جسے ظاہر بین آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اسی پر بس نہیں[1] قیامت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی تفسیر بھی علم المنام کی رُو سے کی جاتی ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم کی کسی آیت کا واضح مفہوم اگر ان کے مفید مطلب نہیں تو وہ کہیں گے اس میں فلاں فلاں لفظ کے متعلق تعبیر نامہ میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے (اور تعبیر ناموں میں ایک ایک لفظ کے متعلق تین تین مفہوم درج ہوتے ہیں تاکہ ہر ایک اپنے مطلب کے مطابق تعبیر لے لے)۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی اس آیت کا مفہوم ہے۔ یعنی ان لوگوں کے نزدیک قرآنِ کریم (معاذ اللہ بمعاذ اللہ) اللہ کے خوابوں کا مجموعہ ہے جس کی تفسیر (نہیں، بلکہ تعبیر) تعطیر المنام (خوابوں کے تعبیر نامہ) کی رُو سے کی جائے گی۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ۔ حقائق کی تفسیر ایسے ظنیات و خرافات کی رُو سے! اور اس پر دعویٰ یہ کہ اس "قرآن فہمی" کا سرچشمہ خاص علم الٰہی ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیئے!

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیے۔ اللہ تعالیٰ نے (نبی اکرمؐ کے بعد) وحی کا دروازہ بند کر دیا تو ان لوگوں نے اسؔ کے دریچے کھول لیے۔ ان میں ایک دریچہ خواب بھی ہیں۔ (جنھیں مبشرات کہا جاتا ہے) اور مبشرات کو نبوّت کا چالیسواں حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ کاذب مدعیانِ نبوّت اپنے دعویٰ کی بنیاد خوابوں پر رکھتے ہیں۔

غور فرمائیے مسلمان کتاب اللہ کے سرچشمۂ نور و ہدایت کو چھوڑ کر جہل اور اوہام کی کیسی کیسی تاریک وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔

سجدہ

گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت یوسفؑ کا کنبہ مصر میں آیا تو آپ نے اپنے ماں باپ کے لیے مسند بچھوائی اور اہلِ دربار بطورِ اظہارِ تعظیم کورنش بجالائے۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (۱۲/۱۰۰)

---

[1] تفصیل ان امور کی میری کتاب "تصوّف کی حقیقت" میں ملے گی۔

اس نے اپنے ماں باپ کو عزت و تکریم کی بلند مسندوں پر بٹھایا اور تمام متعلقین، اہل کار اور خدام یوسفؑ کی وجہ سے ان کی تعظیم بجا لائے۔

لفظ سجدہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم ص۳۵ پر بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مفہوم پیشانی کو زمین پر رکھ دینا نہیں بلکہ اطاعت شعاری کا طریق اظہار ہے جو صرف اللہ کے لیے مختص ہے اور حق بھی یہ ہے کہ انسان کی گردن اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنی نہیں چاہیئے۔ اس لیے قصۂ حضرت یوسفؑ میں سجدہ سے مراد یہ نہیں کہ اہل دربار (یا ان کے بھائیوں) نے سچ مچ زمین پر پیشانی رکھ دی بلکہ اس سے مراد تعظیم ہے۔ اور اگر اس سے مراد وہی سجدہ ہے جس سے انسان اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا ہے تو اس صورت میں "لَهٗ" میں ضمیر کا مرجع خدا لینا ہوگا۔ یعنی اس شوکت و جلال کو دیکھ کر حضرت یوسفؑ کے ماں باپ اور بھائی سب خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے لیکن زبان کے قاعدہ کی رُو سے "رَفَعَ" کے فاعل (حضرت یوسفؑ) کو لَهٗ کی ضمیر کا مرجع قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ اس لیے (اس اعتبار سے) اس آیت کا مفہوم وہی درست ہوگا جو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اہل دربار (اور حضرت یوسفؑ کے بھائی) ادباً اور تعظیماً آپ کے سامنے جھک گئے۔ یا اگر "لَهٗ" کے معنی یہ لیے جائیں کہ "حضرت یوسف کی خاطر" تو اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور آپ کے بھائیوں نے آپ کی اس قدر عظمت و شوکت دیکھی تو اس کے لیے خدا کے حضور سجدۂ تشکر ادا کیا۔ بہرحال، یہ ظاہر ہے کہ مسلمان کے لیے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے (تعظیم ہی کے لیے کیوں نہ ہو) سجدہ ریز ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ عبدِ مومن ایک خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو کر ساری دنیا کی چوکھٹوں سے سرفرازانہ بے نیاز گزر جاتا ہے۔

نہ تو قرآن کریم نے اس کی تصریح کی ہے کہ شاہِ مصر آپ پر ایمان لے آیا تھا یا نہیں اور نہ ہی تاریخ اس واقعہ پر کوئی روشنی ڈالتی ہے۔ اس لیے اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ خدا کے رسولؑ تھے۔ ان کا مقصد فقط اتنا ہی نہ تھا کہ اپنی بریت ثابت کرا کر قید خانہ سے نکل آئیں اور اس کے بعد بادشاہ کی حکومت میں شریک ہو کر نظامِ مملکت کی اصلاح کریں۔ رسول کے ذمہ خدا کا پیغام پہنچانا اور اس کے مطابق نظامِ زندگی قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بادشاہ آپ کی رسالت پر ایمان لے آیا ہوگا۔ حالات بھی اس کے موید ہیں۔ بادشاہ نے آپ کے بلند کیریکٹر کا خود مشاہدہ کر لیا۔ ملک کے انتظام میں —

لہ آپ کی رسالت کے متعلق دیکھئے ۶ / ۸۲-۸۳

فراست و تدبر نکھر کر اس کے سامنے آگئے۔ جب یہ سب کچھ اس کے سامنے آگیا تو حضرت یوسفؑ کی صداقت پر ایمان لانے میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا؟ پھر حضرت یوسفؑ اخیر عمر تک اس ملک میں رہے اور وہیں متمکن فی الارض ہوئے۔ اگر وہ آپ کی دعوت کا انکار کرتا تو نہ آپ وہاں رہنا گوارا کرتے نہ وہ آپ کو وہاں رہنے دیتا۔ ان قرائن سے بھی ظاہر ہے کہ نظامِ مملکت حضرت یوسفؑ کے تجویز فرمودہ خطوط پر متشکل ہوا ہوگا۔ اگرچہ نسبت کی رُو سے اسے "بادشاہ کا قانون" ہی کہا جاتا تھا۔ حضرت یوسفؑ کو وہاں کس قسم کے اختیارات حاصل تھے؟ اس کے لیے قرآنِ کریم کے ان الفاظ پر پھر غور فرمائیے جہاں ارشاد ہے کہ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ (۱۲/۵۶) اس طرح ہم نے یوسفؑ کو مصر میں متمکن کر دیا کہ وہ جس طرح چاہے وہاں کے نظم و نسق کو چلائے۔ یعنی آپ کے اختیارات اس قدر وسیع تھے۔ بائبل میں اس موقع پر لکھا ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کو کُل اختیارات دے رکھے تھے۔ خود حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ (۱۲/۱۰۱) "میرے اللہ نے مجھے حکومت عطا فرمائی"۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ آخر الامر حکومت آپ ہی کی قائم ہوئی۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ (معاذ اللہ) کسی طاغوتی نظام کے ممد و معاون نہ تھے، بلکہ آپ نے اس طاغوتی نظام کو خدائی نظام میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس باب میں سب سے عظیم اور محکم شہادت تو یہ ہے کہ جو شخص قید خانہ میں یہ اعلان کرتا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) "حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں" اور اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۲/۴۰) "اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو"۔ کیا ایک ثانیہ کے لیے بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے باطل کے نظام... کی محکومیت اختیار کر لی ہوگی۔

سورۂ مومن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم بھی حضرت یوسفؑ پر ایمان لے آئی تھی اگرچہ سب کی سب نہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے ضمن میں (جن کی بعثت حضرت یوسفؑ سے قریب چار سو سال بعد ہوئی) دربارِ فرعون کا مردِ مومن اپنی قوم سے کہتا ہے:

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ ... (۴۰/۳۴)

اور دیکھو! اس سے پہلے یوسفؑ بھی تمہاری طرف خدا کے واضح قوانین لے کر آیا تھا لیکن تم نے اُن قوانین کے بارے میں بھی شک کرنا نہ چھوڑا۔ چنانچہ جب وہ فوت ہوگیا (تو تم خوش ہوگئے چلو یہ قصہ ختم ہوا)۔ اب اس کے بعد اللہ کسی رسول کو ہماری طرف نہیں بھیجے گا (اور کوئی ہمیں روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوگا)۔

یہاں سے یہ واضح ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا پیغام (رسالت) قومِ مصر تک پہنچایا تھا۔ اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ آیا اسے پوری کی پوری قوم نے ردّ کر دیا یا تسلیم بھی ہؤا اور ردّ بھی ہؤا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ حقیقت کہ حضرت یوسفؑ عمر بھر مصر میں رہے اور ممتاز حیثیت سے رہے، اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ان کے پیغام کو تسلیم کیا گیا تھا ورنہ نہ یہ ممکن تھا کہ پوری قوم کی مخالفت کے باوجود آپ ایک ممتاز حیثیت سے وہاں رہ سکتے اور نہ ہی یہ کہ آپ بحیثیت رسول، اپنی تبلیغ سے باز رہتے۔ اس لیے اس حقیقت اور دربارِ فرعون کے مردِ مومن کی محولہ صدر تقریر کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ آپ کا پیغام تسلیم بھی کیا گیا اور اس کی بابت شک بھی کیا گیا اور یہ بھی کہ بادشاہ اور اس کا آئینِ حکومت حضرت یوسفؑ کی منشاء کے مطابق تھا۔ اس کے لیے اس عظیم شہادت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو ابھی ابھی پیش کی جا چکی ہے یعنی اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (۱۲/۴۰)



نبوّت اور وراثت

قرآنِ کریم سے واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد ان کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ بھی نبی تھے۔ پھر اُن کے بعد اُن کے بیٹے حضرت یعقوبؑ اور اُن کے بعد اُن کے بیٹے حضرت یوسفؑ بھی۔ اس سے سطح بین نگاہیں اس طرف جا سکتی ہیں کہ خاندانِ حضرت ابراہیمؑ میں نبوّت وراثتاً منتقل ہوتی رہی تھی، یہ صحیح نہیں۔ آپ انڈکس میں نبوّت اور وحی کے عنوانات دیکھئے، یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ نبوّت کا ورثہ میں مل جانا تو ایک طرف، یہ کسی کو کسب و ہنر سے بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اسلام میں تو حکومت بھی وراثتاً نہیں مل سکتی۔ چہ جائیکہ نبوّت وراثتاً مل جائے۔ نبوّت خالصتہً موہبتِ خداوندی تھی۔ ہونے والے نبی کو تو وحی ملنے سے ایک دن پہلے تک بھی اس کا علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ نبوّت سے سرفراز ہونے والے ہیں چہ جائیکہ نبوّت وراثتاً مل جائے۔ نبوّت انتخابِ خداوندی کا نتیجہ ہوتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر کوئی شخصیت اس مقصد کے لیے معیارِ خداوندی پر پُوری اُترتی تھی تو اُسے اس لیے مسترد نہیں کر دیا جاتا تھا کہ وہ کسی نبی کا بیٹا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں جس طرح بادشاہت وراثتاً منتقل ہوتی ہے، اسی طرح "پیری مریدی" بھی۔ بادشاہ کا بیٹا (پہلے ولی عہد اور اس کے بعد) بادشاہ۔ اسی طرح حضرت صاحب (پیر جی) کا بیٹا (پہلے خلیفہ اس کے بعد) خود پیر۔ اور یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا ہے۔ یہی کیفیت ذاتوں، برادریوں، گوتوں کی ہے۔ سیّد کا بیٹا سیّد۔ راجپوت کا بیٹا راجپوت، حتّٰی کہ ناموں کے ساتھ قاضی اور مفتی (یعنی کسی زمانے میں ان کے اسلاف میں سے کوئی قاضی یا مفتی ہوگا، اس کی اولاد پیدائشی قاضی اور مفتی بن گئی)!

یہ وہ نسل پرستی ہے جسے مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا!



مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس عظیم مقصد کو بھی چند الفاظ میں سمیٹ کر بیان کر دیا جائے جس کے لیے قرآنِ کریم نے اس داستان کو اس تابندگی سے پیش کیا ہے۔

مساعد حالات اور موافق ماحول میں راست بازی اور دیانت داری کی زندگی بسر کرنا چنداں دِقّت طلب نہیں ہوتا لیکن مشکل وہاں آپڑتی ہے جہاں ماحول نامساعد اور حالات مخالف ہوں۔ ایسے وقت میں حق و صداقت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا یقیناً مِن عَزمِ الاُمُور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کے صحیح کیریکٹر اور بلندیٔ سیرت کا اندازہ بھی ایسے ہی ناموافق حالات میں لگایا جا سکتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف مکر و فریب کے جال بچھ رہے ہیں۔ جھوٹ اور طمع کاری کو ہر طرف فروغ حاصل ہے۔ جو جس قدر زیادہ زمانہ ساز اور فریب کار ہے، اتنا ہی کامیاب و کامران ہے۔ صداقت اور راست اطواری کا ہر طرف گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ اس طرزِ زندگی سے قدم قدم پر مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں مسابقت، تصنّع اور فریب کاری سے حاصل ہو رہی ہے۔ سچے اصولوں پر کاربند رہنے سے ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے۔ آپ اس دوراہے پر ٹھٹک کر رُک جاتے ہیں۔ ذہنی کشمکش آپ کو کچھ فیصلہ نہیں کرنے دیتی۔ کامیابیوں کا لالچ آپ کو بھی یہ فریب دیتا ہے کہ جن حربوں سے دوسرے لوگ کام نکال رہے ہیں، وہی مجھے بھی استعمال کرنے چاہئیں۔ دوسری طرف اصُول پرستی ہے کہ وہ اس فریب کارانہ روش میں ہر مقام پر عناں گیر ہوتی ہے۔ ان حالات میں وہ لوگ جن کے سامنے نصب العین فقط حصولِ مفاد ہوتا ہے، (خواہ اس کے لیے کسی قسم کے ذرائع بھی کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں) اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جو کچھ اور لوگ کر رہے ہیں ہمیں بھی وہی کرنا چاہیئے۔ نفس کا فریب یہ خوش آئند دلیل پیش کر کے "اطمینان" دلا دیتا ہے کہ ایک فرد کی اصول پرستی سوائے اس کے کہ اس کی اپنی تباہی کا موجب بن جائے، اور کیا نتیجہ پیدا کر سکتی ہے۔ عوام ہی نہیں (بلکہ تنہا عقل کے زور پر مسائلِ حیات کو حل کرنے والے نظام میں) بڑے بڑے مفکّرین بھی اسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ یورپ کا فلسفۂ اخلاق کا بہت بڑا علمبردار "ہربرٹ اسپنسر" (HERBERT SPENCER) لکھتا ہے:-

مثالی زندگی بسر کرنے والے انسان کے لیے دوسری قسم کے انسانوں کے اندر مثالی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ ان فریب کار لوگوں میں جن کا کوئی اصول نہ ہو، خالص سچائی اور صاف دِلی، یقیناً ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔

ایسی روش زندگی پر، جو عام مروجہ مسالک زندگی کے خلاف ہو، کامیابی کے ساتھ قائم نہیں رہا جا سکتا۔ یہ چیز آخرکار اس انسان کی اپنی یا اس کی نسل کی یا دونوں کی موت کا باعث ہوتی ہے۔

(THE PRINCIPLES OF ETHICS PART II P. 106)

ان لوگوں کے ایسے ہی فیصلے ہونے چاہئیں۔ لیکن جن کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے وہ ناموافق حالات اور نامساعد احوال و ظروف کے طوفان میں حق و صداقت کی چٹان بن کر کھڑے رہتے ہیں اور پھر دنیا دیکھتی ہے کہ آخرالامر (ان کے اپنے سامنے یا ان کے بعد) ماحول کو ان کی روش کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ ان کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ اس حقیقتِ کبریٰ کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ ؎

حدیثِ بےخبراں ہے "تو بازمانہ بساز"
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!

حضرت یوسفؑ کی داستانِ زریں اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک فرد کا حسنِ کردار، باطل کے نظام کو اُلٹ کر حق کا نظام قائم نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس فرد کا مثالی کردار، اس قسم کی جماعت پیدا کرنے کے لیے بڑا ممد و معاون ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے (FIRST CRYSTAL) بن جاتا ہے!

اس قصے میں دوسری چیز ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ عالمِ اسباب میں اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے پروگرام کو اسباب و علل کی کڑیوں سے ہی ظہور میں لاتا ہے۔ کنعان کے ایک "چرواہے" کو ان بلندیوں تک پہنچانے میں، جہاں "چاند اور ستارے" اُس کے سامنے جھکیں، اندھے کنوؤں، مصر کے بازاروں اور قید و بند کی مصیبتوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ بلندیاں ملتی ہی اس استحکامِ خودی کے نتیجہ میں ہیں جن کا مظاہرہ ان نامساعد حالات میں ہوتا ہے۔



سورۂ یوسفؑ، آیت (۱۰۲/۱۲) تک پہلے آ چکی ہے۔ آخری تین آیتوں میں کہا گیا تھا کہ ان واقعات کو حضورؐ پر بذریعہ وحی منکشف کیا گیا تھا، لہٰذا یہ یقینی ہیں۔ ان میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے باوجود اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ حالانکہ (اے رسولؐ!) تم اس کے لیے ان سے اجر نہیں مانگتے۔ لیکن اس سے افسردہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لیے کہ یہ قرآن اسی قوم کے لیے نہیں کہ اگر انہوں نے اسے نہ مانا تو یہ بیکار

رہ جائے گا۔ یہ قیامت تک نوعِ انسانی کے لیے ضابطۂ ہدایت ہے۔ اگر یہ اسے قبول نہیں کرتے تو اور قومیں اسے اختیار کرلیں گی۔ نوعِ انسان کو آخرالامر آنا اسی کی طرف ہے۔

(جیسا کہ معلوم ہے) قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ یہ قانونِ مکافاتِ عمل کی نتیجہ خیزی کے سلسلہ میں اقوامِ سابقہ کی روش و نظامِ زندگی کے عواقب اور خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی کو بطور دلائل اور ثبوت پیش کرتا ہے۔ داستانِ حضرت یوسفؑ کے خاتمہ پہ کہا کہ اگر یہ لوگ اس قسم کے تاریخی شواہد پر غور و فکر نہیں کرتے تو اس میں تعجب اور تأسف کی کون سی بات ہے۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ :

۱۲/۱۰۵ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

(قرآن کی تعلیم تو پھر بھی ایک نظری دعوت ہے جو حروف و الفاظ کی شکل میں ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ ان کی تو یہ حالت ہے کہ) کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی کی کتنی کتنی بڑی محسوس شہادات ہیں، جن سے یہ منہ پھیرے گزر جاتے ہیں (اور غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔)

دُنیا میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو سرے سے خدا ہی کو نہیں مانتے۔ لیکن اکثریت ان کی ہے جو خدا کو مانتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ انسانوں کی اطاعت اور محکومیت بھی اختیار کیے رہتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق کہا کہ :

۱۲/۱۰۶ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

(ان میں کچھ تو ایسے ہیں کہ قوانینِ خداوندی سے یکسر انکار کرتے ہیں۔ اور) اکثر ایسے ہیں کہ وہ خدا کے قانون کو مانتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی صاحبِ اقتدار و اختیار تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح مومن کہلانے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔

اس آیت کی تشریح 'مطالبُ الفرقان' جلد پنجم ص۲۲ میں گزر چکی ہے۔ زیرِ نظر سورہ (یوسفؑ) میں ایمان باللہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔۔۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ...... (۱۲/۴۰) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰) اس میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔

انڈکس میں "شرک" کے عنوان کو دیکھئے۔ واضح ہو جائے گا کہ زیرِ نظر آیت (۱۲/۱۰۶) خود ہمارے متعلق ہے۔ یہ ہم ہی

ہیں جو خدا پر ایمان کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور انسانوں کی محکومیت بھی اختیار کرتے ہیں۔ حاضرو موجود حکمرانوں کو چھوڑیئے، مذہب کی دنیا میں ساری کی ساری اطاعت شخصیتوں (اسلاف) کی ہوتی ہے خواہ ان کا نام کچھ ہی رکھ لیا جائے۔ یاد رکھیے! دین کے معاملہ میں جہاں (کتاب اللہ کو نہیں بلکہ) کسی انسان کو اتھارٹی تسلیم کر لیا جائے تو یہ شرک ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو جتنا کوئی شخص زیادہ مذہب پرست ہوگا اتنا ہی زیادہ مشرک ہوگا۔ سیکولرازم کفر ہے لیکن اس قسم کی مذہبیت شرک ہے۔ یہی آیہ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے۔

قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی، حق و باطل کی آمیزش (شرک) کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے (۱۵؍۷) انڈکس میں اقوامِ سابقہ کا عنوان دیکھیے۔ اس مقام پر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی جب فرمایا کہ:

۱۲/۱۰۷ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِیَهُمْ غَاشِیَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

کیا یہ لوگ اس سے بالکل مطمئن ہو چکے ہیں کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے آنے والی تباہیوں میں سے ان پر کوئی ایسی تباہی نہیں آئے گی جو ان پر ہر طرف سے چھا جائے؟ یا وہ آنے والا انقلاب اس طرح اچانک آ جائے کہ انہیں اس کے آنے کا احساس تک نہ ہو۔

اگلی آیت میں دین کی اصل و اساس کو چند لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ قرآن اپنے ہر دعویٰ کو علم و بصیرت کی رُو سے پیش کرتا اور دلیل و برہان کی رُو سے منواتا ہے۔ وہ فریقِ مخالف سے بھی اس کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا جو زبردستی لایا جائے۔ یعنی جن دعاوی کو علم و عقل کی رُو سے تسلیم نہ کیا جائے وہ اسے ایمان ہی نہیں قرار دیتا۔ آپ انڈکس میں علم، عقل، بصیرت وغیرہ عنوانات دیکھئے۔ یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آ جائے گی۔ چونکہ دین کی اس بنیادی حقیقت کے متعلق سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل و تشریح کے ساتھ لکھا جا چکا ہے اس لیے اس مقام پر کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہاں قرآنی دعوت پر علم و عقل کی رُو سے غور و فکر کرنے والوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

۱۲/۱۰۸ قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ ۛ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

ان سے کہو میری راہ تو بالکل (صاف اور سیدھی) ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں خدا کی طرف دلائل و براہین کی رُو سے، علی وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں ـــــ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے وہ بھی ایسا ہی کریں گے ـــــ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ (اسے کائنات کے چلانے کے لیے اور قوتوں کی بھی ضرورت ہو۔) اس لیے میں ان میں سے نہیں ہوں جو قانونِ خداوندی کو بھی تسلیم کریں اور اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی اختیار و اقتدار کی مالک سمجھیں۔ (اور یوں مومن کہلاتے ہوئے مشرک کے مشرک رہیں)۔

علم و بصیرت کی رُو سے دین کو پیش کرنا اور دلیل و برہان کی رُو سے اُسے ماننا۔ یہ ہے ارشادِ خداوندی ـــ اور یہ ہے سنّتِ رسول اللہ ـــ اور اسی کو جماعتِ مومنین کا شیوہ اور طریق بتایا گیا۔ دین کی دعوت پیش کرنے میں جو شخص اس طریق کو اختیار نہیں کرتا وہ ارشادِ خداوندی سے سرکشی برتتا اور سنّتِ رسول اللہؐ کی مخالفت کرتا ہے۔

دین کے اس بنیادی اصول کی روشنی میں آپ غور فرمائیے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ صدرِ اوّل میں اسلام، بزورِ شمشیر پھیلایا گیا تھا اور یہ کہ جو شخص اسلام چھوڑنا چاہے (مُرتد) اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ یہ کس طرح دین کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ انڈکس میں "مودودی ازم" کا عنوان دیکھئے۔ نیز جنگ، قتال اور جہاد کے عنوانات

اس کے بعد مخالفین کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ رسول انہی جیسا انسان کیوں ہے۔ فرمایا:

۱۲/۱۰۹ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

(اور یہ جو اُن کا اعتراض ہے کہ ایک انسان کس طرح سے رسول ہو سکتا ہے، تو ان سے کہو کہ) مجھ سے پہلے بھی خدا نے کسی رسول کو نہیں بھیجا بجز اس کے کہ وہ وہاں کی بستی کے رہنے والوں میں سے ایک آدمی تھا۔ (۲۱/۷؛ ۱۸/۱۱۰)

کیا یہ لوگ (جو اس قسم کی کٹ حجتیاں کرتے ہیں) دُنیا میں چلے پھرے نہیں جو دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے ان سے پہلے (اس قسم کی روش اختیار کی تھی)؟ اگر یہ لوگ (آنکھیں کھول کر تاریخی شواہد کا

مطالعہ کرتے اور عقل و فکر سے کام لیتے، تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ (حق و باطل کی کشمکش میں) آخر الامر کامیابی اور تمکّن انہی کو حاصل ہوا جو تخریبی کارروائیوں سے بچتے ہوئے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ (لہٰذا، ان سے کہو کہ حق و باطل کا فیصلہ اس سے نہیں ہوتا کہ رسول، دوسرے انسانوں جیسا انسان ہوتا ہے یا، تمہارے تصور کے مطابق، فوق البشر، اس کا فیصلہ اس سے ہوتا ہے کہ جو قانون وہ پیش کرتا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اور اس کی خلاف ورزی کے عواقب کیا؟ اس کی شہادت تاریخی سرگزشتیں بھی بہم پہنچا سکتی ہیں)۔

آپ عنوان "رسول" کے تحت دیکھیں گے کہ یہ اعتراض ہر رسول کے خلاف کیا جاتا تھا اور اس کا جواب یہی دیا جاتا تھا کہ رسول فوق البشر نہیں ہوتے۔

اس آیت میں، اور اس کے علاوہ دو مقامات پر اور (۱۶/۴۳؛ ۲۱/۷) میں رسولوں کو رِجَالًا کہا گیا ہے۔ یعنی مرد۔ اگرچہ عربی زبان میں رجال کا لفظ ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم "لوگ"، یا "اشخاص" کے الفاظ بولتے ہیں (دیکھئے لغات القرآن)، لیکن یہ واقعہ ہے کہ تمام رسول مرد ہی تھے۔ اس سے وہ لوگ جنھوں نے اس پر ادھار کھا رکھا ہے کہ کسی نہ کسی طرح عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں کمتر ثابت کیا جائے، یہ دلیل بھی لاتے ہیں کہ کوئی عورت نبی نہیں تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ عورت، مرد کے مقابلہ میں فروتر ہے۔

نبوت اگر اس شخص کا ذاتی معاملہ ہوتا جسے وحی عطا ہوتی تھی، تو عورتوں کی طرف بھی وحی ہو جاتی[1]۔ لیکن نبی کا فریضہ رسالت بھی تھا اور اس فریضہ کا مفہوم تھا دنیا جہان کی سرکش طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کر کے انقلابِ عظیم برپا کرنا۔ اگر عورت کے ذمے یہ فریضہ عاید کر دیا جاتا تو فطرت کی طرف سے جو مخصوص وظائف اس کے سپرد کیے گئے تھے، وہ انہیں سرانجام نہ دے سکتی۔ یہ تقسیم عمل ہے جس کے یہ معنیٰ نہیں کہ عورتیں، عورت ہونے کی جہت سے مردوں سے کم تر ہیں۔ انڈکس میں عنوان "عورت" دیکھئے۔

اس کے بعد قرآن اس کشمکش کا ذکر کرتا ہے جس سے رسول کو دو چار ہونا پڑتا تھا۔ رسالت کا اوّلین مرحلہ یہ تھا کہ رسول اپنی قوم کے لوگوں تک اپنی دعوت پہنچاتا اور انہیں اسے قبول کرنے پر آمادہ کرتا۔ اس میں اسے (اکثر) بہت کم کامیابی ہوتی، حتیٰ کہ ایک ایسا مقام آجاتا جہاں یہ نظر آتا کہ جن سعادت مند اشخاص نے اس کی دعوت کو قبول کرنا تھا وہ کر چکے ہیں۔ باقی مخالفین اُسے قبول نہیں کریں گے۔ ان کے اس دعوت کے قبول کرنے کے راستے میں ایک بات

---

[1] جیسے اہلِ تصوف کے ہاں عورتیں بھی "ولی" ہوتی ہیں (مثلاً رابعہ بصریؒ)

یہ بھی حائل ہوتی کہ رسول جو ان سے کہتا کہ اگر انہوں نے اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا تو وہ اصرار کرتے کہ اس تباہی کو جلدی لاؤ۔ لیکن اسے خدا کے مقرر کردہ قانونِ مُہلت کی رُو سے اپنے وقت پر آنا ہوتا تھا۔ اس پر وہ خیال کر لیتے کہ تباہی کی وعید محض دھمکی ہے، درحقیقت ایسا نہیں ہوگا (سابقہ جلدوں میں یہ حقیقت بار بار سامنے آچکی ہے) اس کے بعد فیصلہ کُن مرحلہ آتا جس میں حق کے مخالفین کو شکست ہوتی (یا وہ تباہ ہو جاتے) اور جماعتِ مومنین کامران و کامیاب ہو جاتی (اس سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد سوم ص۲۹۵ تا آخر دیکھئے جہاں ان مراحل کی تفصیل بیان کی گئی ہے) فرمایا کہ اس کشمکش میں ایسے مراحل آتے کہ :

۱۲/۱۱۰ حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّىَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

(لیکن یہ تاریخی شہادتیں یہ بھی بتائیں گی کہ حق و باطل کی اس کشمکش کا فیصلہ یونہی جھٹ سے نہیں ہو جاتا، اس کے لیے بڑا لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں بعض اوقات یہ عرصہ اتنا لمبا ہو جاتا تھا کہ رسول دل برداشتہ ہو جاتے تھے کہ اب یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور لوگ اپنے دل میں سمجھ لیتے تھے کہ انہیں تباہی اور بربادی کے جس عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، وہ خالی دھمکیاں ہیں۔ تو اُس وقت ہمارے رسولوں کی طرف ہماری نُصرت آتی تھی۔ سو ہم اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق (رسول اور اس کی جماعت کو) تباہی سے محفوظ رکھتے تھے، اور مجرمین سے وہ عذاب ٹلا نہیں کرتا تھا۔

(سو جس طرح، اقوامِ سابقہ کے ساتھ ہُوا، اسی طرح اِن لوگوں کے ساتھ ہوگا)

اور آخر میں ان جُملہ حقائق کو ایک آیت میں سمٹا کر رکھ دیا۔

۱۲/۱۱۱ لَقَدْ كَانَ فِىْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰـكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

ہم اقوامِ سابقہ کے جو احوال و کوائف بیان کرتے ہیں، ان میں ان لوگوں کے لیے سامانِ عبرت و موعظت ہے جو عقل و فکر سے کام لیں۔ (اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ) قرآن کوئی من گھڑت کتاب نہیں۔ یہ اُن تمام دعاوی کو سچ کر دکھائے گا،

جو اس سے پہلے، انبیاء سابقہ کی وساطت سے کیے گئے تھے۔ اس میں وہ تمام اصول و قوانین دے دیئے گئے ہیں جن کی نوعِ انسان کو صحیح زندگی بسر کرنے کے لیے ضرورت تھی۔ اِن اصول و قوانین کو اس طرح نکھار اور اُبھار کر بیان کیا گیا ہے (کہ اِن میں کسی قسم کا التباس نہیں) (۱)

یہ وہ ضابطہ ہے جو ہر اُس قوم کو، جو اس کی صداقت پر یقین رکھے، سفرِ حیات میں راہ نمائی کا کام دے گا اور اس کے لیے سامانِ نشو و نما فراہم کرے گا۔

(یہ ہے تمام نوعِ انسان کے لیے خدا کی طرف سے آخری اور مکمل ضابطۂ حیات)

اس ارتکاز پر سورۃ یوسف اختتام پذیر ہوتی ہے۔



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تیرہواں پارہ ـــــــــــــــــــ تیرہویں سورۃ



باب دوم
سُوْرَۃُ الرَّعْدِ

یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ

- قرآنِ کریم اور سائنسی حقائق۔
- نظامِ کائنات اور اجرامِ فلکی۔
- کائنات میں نظامِ ربوبیّت سے حیاتِ آخرت پر استدلال۔
- قوموں کی زندگی میں موت و حیاتِ نو کے اصول۔
- قرآن، علومِ سائنس کا نصاب نہیں، انسانی رہنمائی کا ضابطہ ہے۔
- قوموں کے احوال میں تبدیلی، تغیرِ نفس کے بغیر ممکن نہیں۔
- مسئلہ خیر و شر۔
- بقا اُسی کے لیے ہے جو نوعِ انسان کے لیے منفعت بخش ہے (قانون بقا للانفع)۔
- دنیا اور آخرت کی خوشگواریوں کا تقابل۔
- اُمّتِ واحدہ کی تشکیل کا عملی پروگرام، نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ انفاق کا قیام۔
- قرآن اپنے دعاوی کو دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتا ہے جبکہ عجوبہ پرستی کا تقاضا معجزہ طلبی ہوتا ہے۔ دین کو زبردستی منوانا مقصودِ ربانی نہیں۔
- اطمینانِ قلب، خدا کے قانون کی مُطابقت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔
- جنّت اور جہنّم کی حقیقت بسیط حقائق کا تمثیلی اندازِ بیان۔
- رسولوں کی بشریّت۔
- خُدا کا قانونِ محو و ثبات۔
- رسولوں کا فریضہ' خدا کے پیغام کو انسانوں تک پہنچا دینا ہے۔ نتائج' اس کے قانونِ حساب کے مُطابق ظہُور پذیر ہوتے ہیں۔
- قرآن انسانی دُنیا میں جو انقلاب لانا چاہتا ہے اُسے روکا نہیں جا سکتا۔

باب دوم

سُورَۃُ الرَّعۡدِ

تیرھویں سُورۃ

آپ مطالبُ الفرقان کی سابقہ جلدوں کو دیکھئے۔ قرآنِ کریم نے تسخیرِ کائنات کے متعلق بڑی کثرت، تفصیل اور تکرار سے بیان کیا ہے (انڈکس میں کائنات اور ملائکہ کے عنوانات بالخصوص دیکھئے) اس سے دو اہم مقصد پیشِ نظر تھے۔ ایک تو یہ کہ انسان نے اپنے عہدِ طفولیت میں مظاہرِ فطرت کو الوہیاتی مقام دے رکھا تھا۔ وہ انہیں دیوی دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش کرتا تھا۔ عربوں کے ہاں بھی یہ عقاید بڑی شدّت سے موجود تھے (دیکھئے $\frac{53}{19-27}$) قرآن نے انسان کے ان جہالت آمیز عقاید کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ فطرت کی ان قوّتوں کو الوہیاتی اقتدار حاصل نہیں — یہ سب خدا کے مقرّر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہیں، اس لیے خود خدا نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ معیّن قوانین کے مطابق یہ قوّتیں مصروفِ عمل ہیں۔ ان کے سمجھنے کی صلاحیت انسان میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ جو قوم ان قوانین کا علم حاصل کرے گی وہ ان قوّتوں کو مسخّر کر لے گی۔ اس سے "آدم مسجودِ ملائکہ" بن جائے گا۔ (دیکھئے مطالبُ الفرقان جلد دوم باب اوّل ص۶۷)۔ رعد (بادل کی گرج) بھی انہی ملائکہ میں شامل ہے۔ جیسا کہ سابقہ حوالہ میں بتایا گیا ہے۔ ایک حدیث میں بھی کہا گیا ہے کہ رعد "ملک من الملائکہ" (ملائکہ میں سے ایک ملک) ہے۔ غالباً اس کی اس اہمیت کے پیشِ نظر اس سورۃ کا نام سُورۃ الرّعد رکھا گیا ہے۔ رعد کا لفظ ایک تو اسی سورۃ کی آیت نمبر ۱۲ میں آیا ہے اور دوسرے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۹ ($\frac{2}{19}$) میں۔ یوں تو علومِ سائنس کے متعلق مطالبُ الفرقان میں جستہ جستہ مختلف مقامات پر لکھا جا چکا ہے لیکن جلد ششم، سورۃ الاعراف کے آخری حصہ میں اس موضوع پر تفصیل سے آیا ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔

ان تصریحات کے پیشِ نظر موجودہ سورۃ (الرّعد) میں مظاہر و قوای فطرت کے متعلق جو کچھ آئے گا اس کے

متعلق کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہاں صرف حوالہ دے کر آگے بڑھ جایا جائے گا۔ اس سُورۃ کی پہلی آیت ہے:

۱۳/۱ الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①

خدائے علیم وحکیم ورحیم کا ارشاد ہے کہ یہ کتابِ خداوندی (قرآن) کی آیات ہیں یعنی اُس ضابطۂ خداوندی کے قوانین، جو تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے، تجھ پر بذریعہ وحی نازل کیا جاتا ہے اور جو یکسر مبنی برحقیقت ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس کے باوجود اس کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے۔

اس کے فوری بعد نظامِ کائنات کا ذکر آگیا:

۱۳/۲ اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ②

یہ اُس خدا کی طرف سے ہے جس نے اتنے بڑے بڑے اجرامِ فلکی کو، فضا کی بلندیوں میں معلّق کر رکھا ہے اور، جیسا کہ تم دیکھتے ہو، کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں۔ (یہ صرف اس کا قانونِ کشش وجذب ہے جس کے سہارے یہ قائم ہیں) اس لیے کہ کائنات کا مرکزی کنٹرول خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح اس نے سورج اور چاند، سب کو اپنے قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک، ایک مدتِ معیّنہ کے لیے اپنے اپنے راستے پر چلا جا رہا ہے۔

جس خدا کا ہمہ گیر قانون خارجی کائنات میں یوں تدابیر الامور کرتا ہے، وہی خدا، اپنے اُس قانون کو جس کے مُطابق انسان کو زندگی بسر کرنی چاہیئے، کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں اس حقیقت کا یقین ہو جائے کہ تمہیں بھی اسی قانون کا سامنا کرنا ہے۔ تم اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا میں ایک عظیم سائنٹیفک حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اتنے اتنے بڑے عظیم الجثّہ کرّوں کا فضا میں معلّق اور مصروفِ گردش رہنا بڑا محیّر العقول واقعہ ہے۔ تمہاری نگاہ ان ستونوں کو تلاش کر رہی ہوگی جن کے سہارے یہ کرّے قائم ہیں۔ کہا کہ وہ ستون تو ہیں لیکن غیر مرئی۔ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ یہ ستون کشش و جذبِ باہمی ہے جس سے یہ کرّے معلّق ہیں۔ لیکن کشش وجذب غیر محسوس اور غیر مرئی قوّت ہے۔ یہی الفاظ (۳۱/۱۰) میں بھی

آئے ہیں۔

دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى - یہ تمام مظاہرِ فطرت ایک مدّتِ معیّنہ کے لیے رواں دواں ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ کائنات نہ ازلی ہے (کیونکہ مخلوق ہے)، نہ ابدی۔ (۱۳/۲۹)

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ سلسلۂ کائنات مشین کی طرح (AUTOMATICALLY) خود بخود نہیں چلا جارہا۔ اس کا خالق اس کے پیچھے ہے۔ اس کی تدابیر کے مُطابق یہ سرگرمِ عمل ہے۔

اس کے بعد بنیادی نکتہ اگلے الفاظ میں واضح کر دیا کہ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآنِ کریم سائنس کی کتاب نہیں جس میں قوانین و مظاہرِ فطرت کی سرگرمیوں کا ذکر ہے اور بس۔ کہا کہ یہ ذکر ایک عظیم مقصد کی طرف لے جانے کے لیے ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ جس طرح نظامِ فطرت ایک ضابطۂ قوانین کے مطابق نتیجہ خیز ہوتا ہے اسی طرح خود انسان کے اعمال بھی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق نتائج مرتب کرتے ہیں۔ قوانینِ فطرت کے تذکرہ سے مراد تمہاری توجہ قانونِ مکافات کی طرف منتقل کرانا ہے۔

نظامِ فطرت اور قانونِ مکافاتِ عمل کے باہمی تعلّق کے سلسلہ میں مطالبُ الفرقان جلد دوم صـ۹۳ پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اس قانون کی ابتداء نظامِ ربوبیّت سے ہوتی ہے جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔

(۱۳/۳—۴) وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۳ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۴

تم غور کرو کہ اس کا قانونِ ربوبیّت، کائنات میں کس طرح کارفرما ہے۔ اس نے (زمین کے گول ہونے کے باوجود) اس کی سطح کو اس طرح پھیلا دیا ہے (کہ تم اس پر آسانی سے رہ سکو) اور اس میں پہاڑ بنا دیئے اور ان سے دریاؤں

کا سلسلہ جاری کر دیا اور اس میں' ہر اک پھل کے جوڑے، دو دو قسم کے، پیدا کر دیئے اور (زمین کی گردش کا ایسا قاعدہ مقرر کر دیا کہ اس سے) رات کی تاریکی، دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ان تمام امور میں، ان لوگوں کے لیے، جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں، ہمارے قانون کی ہمہ گیری کی، کتنی بڑی نشانیاں ہیں۔

پھر اس پر بھی غور کرو کہ زمین کے مختلف قطعات، ایک دوسرے سے ملحق ہوتے ہیں (لیکن ان میں) کسی میں انگور کے باغ ہیں، کسی میں کھیتیاں ہیں، کہیں کھجور کے درخت ہیں۔ ان میں سے بعض ایک ہی جڑ سے پھوٹ کر الگ الگ ہو جاتے ہیں اور بعض الگ الگ جڑوں سے اُگتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں لیکن' مختلف درختوں کے پھل، خوبیوں کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں (ایک میں ایک خوبی ہے تو دوسرے میں دوسری) اس طرح ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہوتی ہے۔

ان امور میں بھی اُن لوگوں کے لیے، جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں، ہمارے نظامِ ربوبیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

مختلف درخت ایک ہی زمین سے اُگتے ہیں۔ ان کا (SOIL) ایک جیسا ہوتا ہے۔ وہ سیراب بھی ایک ہی جیسے پانی سے کیے جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اُن کے پھل مختلف ہوتے ہیں۔ ثمرات کا یہ فرق بیج کی وجہ سے ہوتا ہے جس قسم کا بیج، اُسی قسم کا پھل! اسی طرح انسانی زندگی کے ثمرات بھی اُن اعمال کے مطابق ہوتے ہیں جو انسان سے سرزد ہوتے ہیں جس قسم کے کسی کے اعمال، اُسی قسم کی اُس کی زندگی۔

(ضمناً) یہاں پر مَدَّ الْاَرْضَ کہا ہے۔ یعنی زمین کو گول ہونے کے باوجود اس طرح پھیلا دیا ہے کہ اس پر انسان بستے ہیں اور ان کی نشوونما کے لیے فصلیں بھی اُگتی ہیں۔ دوسری جگہ کہا ہے اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ [۱۶/۱۵] وہ تمہیں اپنے ساتھ لیے گھوم رہی ہے۔ یہی وہ گردش ہے جو (علاوہ دیگر امور) رات اور دن کے اختلاف کا موجب ہے۔ (یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ)

اس تمام نظام میں بھی ایک عظیم مقصد کی نشانیاں (آیات) ہیں۔ لیکن یہ آیات انہی کو نظر آسکتی ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں۔ (لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ - لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ)

ان آیات میں سب سے بڑی آیت یہ ہے کہ ایک ایسی گٹھلی سے جس میں زندگی کی کوئی رمق نظر نہیں آتی، لہلہاتے پودے کی نمود ہوتی ہے۔ جو نشوونما پاکر مکمل درخت بن جاتا اور ثمر بار ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کی حیاتِ آخرت پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

(۱۳/۵) وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۬ؕ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ⑤

(خدا کے قانونِ تخلیق ونشوونما کی اس قدر گوناگوں نشانیوں کے باوجود، اسے مخاطب!) اگر تو کوئی تعجب انگیز بات سُننا چاہے تو وہ، ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ "جب ہم گل سڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا اس کے بعد ہم ایک نئے انداز سے پھر پیدا ہوں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ (جو سمجھتے ہیں کہ انسان کی زندگی بس اس طبیعی جسم کی زندگی ہے اس سے آگے کچھ نہیں) خدا کے قانونِ تخلیق و ربوبیّت سے انکار کرتے ہیں (اس لیے کہ "ربوبیّت" کے معنی ہی کسی شے کو اس کی تکمیل کے آخری نقطہ تک پہنچانا ہے۔ اور انسان کی تکمیل کا آخری نقطہ اس کی موت نہیں) ایسا کہنے والے وہ لوگ ہیں جو (جہالت اور تقلید کی) زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوتے ہیں کہ (ان کی نگاہ دور تک جا ہی نہیں سکتی۔ وہ وسعتِ نظر اور کشادگیٔ علم سے کام لے ہی نہیں سکتے۔ یہ لوگ زندگی کی وسعتوں سے انکار کر کے کسی اور کا نقصان نہیں کرتے بلکہ اپنے مستقبل کی کھیتیوں کو اس طرح جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا لیتے ہیں کہ ان میں نشوونما کا امکان ہی نہیں رہتا۔

یہاں حیاتِ آخرت سے انکار کو خدا کے قانونِ ربوبیّت سے انکار کے مُرادف قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں زمینِ مُردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرنا" قانونِ ربوبیّت کی کارفرمائی قرار دی گئی ہے[۱۹]۔ یہی قانونِ ربوبیّت انسان کی حیاتِ نَو کے سلسلہ میں کارفرما ہوتا ہے[۱۹]۔ قوموں کی زندگی میں موت وحیاتِ نَو کا سلسلہ اس دُنیا میں بھی جاری رہتا ہے اور اُخروی زندگی میں بھی۔ دنیاوی زندگی میں اس کشمکش کے متعلق فرمایا:

(۱۳/۶) وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ ۖ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ⑥

(ان کی اسی تنگ نظری کا نتیجہ ہے کہ یہ) بجائے اس کے کہ اس کا انتظار کریں کہ تمہاری جدوجہد کے حسین و خوشگوار نتائج سامنے آ جائیں، تم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ جس تباہی کے متعلق تم ان سے کہتے ہو وہ جلدی سے آ جائے۔ انہیں اس کا علم نہیں کہ ان سے پہلے قوموں کی تباہی کی ایسی سرگزشتیں گزر چکی ہیں جو دنیا میں کہاوتیں بن گئی ہیں۔

اس باب میں تیرے نشوونما دینے والے کا قانون یہ ہے کہ لوگوں کے ظلم اور زیادتی کے باوجود (عمل اور اس کے

نتیجہ میں مہلت کا وقفہ رکھا جائے تاکہ جو لوگ اس دوران میں غلط روش کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کرلیں) آنیوالی تباہی سے اُن کی حفاظت ہو جائے (لیکن جو لوگ اس مہلت کے وقفہ سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں) حقیقت یہ ہے کہ خدا کا قانونِ مکافاتِ اعمال کا پیچھا کرنے میں بڑا سخت گیر واقع ہُوا ہے۔

قرآنی تعلیم کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اُس نے عجوبہ پسندی اور کرشمہ بینی کے خوگر انسانی ذہن کو طلسماتی تخیلات سے نکال کر اس پر قانونِ اسباب و علل (CAUSE AND EFFECT) کی اہمیت اور ہمہ گیری مرتسم کی ہے۔ انسانی دنیا کا یہ محیّر العقول انقلاب ہے۔ آج انسانی تہذیب و تمدن کی جو ہوش رُبا ندرت کاریاں ہماری نگاہ کو خیرہ کرتی ہیں وہ سب اسی قرآنی انقلاب کا صدقہ ہیں۔ یہی وہ انقلاب تھا جسے دورِ جاہلیت کا عربی ذہن آسانی سے قبول نہیں کر رہا تھا حضور نبی اکرمؐ انہیں قانون کی تعلیم دیتے تھے اور وہ معجزات طلب کرتے تھے۔

۱۳/۷ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿٧﴾

یہ لوگ جو اس ضابطۂ قوانین کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے، درحقیقت "قانون" کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ اسی لیے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ رسول کوئی محسوس معجزہ کیوں نہیں دکھاتا؟ حالانکہ تیرا کام صرف یہ ہے کہ تو انہیں خدا کے اس قانون سے آگاہ کر دے کہ اگر تم غلط روش پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

پھر ایک بات اور بھی ہے۔ اگر تیری دعوت اسی قوم مخاطب تک محدود ہوتی تو معاملہ کچھ مختلف ہوتا لیکن تجھے تو ہر (موجودہ اور آنے والی) قوم کے لیے راہ نما بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس لیے تیرا منصب یہی ہے کہ تو خدا کے عالمگیر، غیر متبدّل قوانین پیش کرے جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہوں اور جن پر غور و فکر سے ہر قوم راہنمائی حاصل کر سکے۔

"لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" حضورؐ کے آخری نبی ہونے کی ایک اور دلیل ہے۔ حضورؐ کی پیش فرمودہ راہنمائی ہر قوم کیلئے ہے، جو مکمل بھی ہے اور محفوظ بھی۔ اس لیے کسی قوم کے لیے بھی کسی اور نبی کی ضرورت نہیں۔

آیت (۱۳/۶) میں کہا گیا ہے کہ عمل اور اُس کے محسوس نتیجہ کے ظہور میں آنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یعنی عمل کا بیج مختلف مراحل میں سے گزر کر ثمر بار ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت مختلف مثالوں سے کر دی۔ فرمایا۔

۱۳/۸-۹ اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنثَىٰ وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا

تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ⑧ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِیْرُ الْمُتَعَالِ ⑨

(یہ جو اوپر کہا گیا ہے کہ عمل اور اس کے نتیجے میں ایک وقفہ ہوتا ہے تو اس کی بین مثال ان کے سامنے ہے کہ کس طرح حمل قرار پانے سے بچہ پیدا ہونے تک کا عرصہ ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ علمِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ مادہ کے پیٹ میں کیا ہے اور رحم کے اندر، اس میں کون کونسی چیزیں کم ہوتی رہتی ہیں اور کون کون سی بڑھتی ہیں۔ نیز کونسا بچہ تکمیل تک پہنچتا ہے اور کون سا نا تمام رہ جاتا ہے۔ یہ سب اُن اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جو خدا نے مقرر کر رکھے ہیں۔

اُس خدا کے اندازوں کے مطابق جو جانتا ہے کہ کسی شے کی موجودہ حالت کیا ہے اور مستقبل میں وہ کن مراحل سے گزرنے والی ہے۔ (اس کے کون کون سے جوہر مشہود ہو چکے ہیں اور کون کون سے ہنوز پوشیدہ ہیں)۔ اس کا قانون بڑی قوتوں کا مالک اور بلند ترین مقام پر متمکن ہے۔ ایسے بلند ترین مقام پر کہ اس تک کسی کا ہاتھ ہی نہیں پہنچ سکتا۔ جو اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے۔ وہ ہر ایک کی دسترس سے باہر ہے۔

آیت (۸) کے آخر میں کہا گیا ہے کہ "عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ" اس سے ایک اہم نکتہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ خُدا کے علمِ غیب کے متعلق انڈکس کی طرف مراجعت کیجئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن امور کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کا علم خُدا کو ہے، کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، یا انسان بھی ان کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد پنجم (صفحات ۳۸-۳۹) پر بحث ہو چکی ہے۔ وہاں (اور غیب سے متعلق دیگر مقامات میں) یہ بتایا گیا ہے کہ جن امُور کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں، ان کا علم انسان بھی حاصل کر سکتا ہے لیکن جو امور کسی طبیعی قانون کے تابع نہیں، اُن کا علم انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ آیت (۱۳/۸) میں جو کہا تھا کہ وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ۔ تو اس سے مراد وہی امور ہیں جن کے لیے قوانین مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ کائنات کے غیب و شہود کے متعلق مطالبُ الفرقان۔ جلد دوم (ص۹۵)، دیکھئے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کریم میں قوانینِ فطرت اور مظاہر کائنات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اُس سے مقصد یہ نہیں کہ قرآن علومِ سائنس کا کوئی نصاب ہے۔ وہ انسانی راہ نمائی کا ضابطہ ہے اس لیے ان امور سے مقصد ان قوانین کی تائید میں شہادات پیش کرنا ہے جن کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں قوانینِ فطرت سے متعلق گفتگو کرنے کے بعد فرمایا:

(۱۳/۱۰) سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴿۱۰﴾

اس کے قانون کی نگاہ اس قدر باریک بین ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی بات کو چھپائے یا اُسے ظاہر کر دے، یا کوئی شخص دن کی روشنی میں کھلے بندوں چلے یا رات کی تاریکی میں (ادھر اُدھر کچھ کرتا پھرے) اس کے نزدیک سب یکساں ہے۔

انسانی اعمال کو محفوظ رکھنے کے متعلق قرآنِ حکیم میں بے شمار مقامات پر تصریحات آئی ہیں (انڈکس میں مکافاتِ عمل کا عنوان دیکھئے) مندرجہ بالا آیات میں کہا کہ انسان کے ہر عمل کا خدا کو علم ہوتا ہے۔ اگلی آیت کے پہلے حصہ میں ان اعمال کے محفوظ رکھے جانے کا (گویا) عملی طریق بتایا گیا ہے۔

(۱۳/۱۱) لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ

اس کے قانونِ مکافات کی کار فرمائی کے لیے) ہر انسان کے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں متعین ہیں جو اس کے ہر عمل کا پیچھا کر کے، اُسے اس کے نتیجہ تک پہنچاتی ہے (۱۳/۱۰۴) اور انسان کا ہر عمل محفوظ ہو جاتا ہے اور نتیجہ خیز ہو کر رہتا ہے۔

انسانی اعمال درحقیقت محسوس مظاہر ہوتے ہیں اُس کے خیالات، نفسیاتی میلانات ورجحانات، اس کی آرزوؤں، تمناؤں، اُس کے مقاصد اور ارادات کے۔ مطالبُ الفرقان جلد ششم میں زیر آیت (۸/۵۳) تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ فرد ہو یا قوم اُن کی زندگی کا مدار اُن کی ذہنیت اور نفسیات پر ہوتا ہے۔ جب تک اُن میں تبدیلی نہ ہو، اُن کی زندگی میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ جن عوامل سے یہ تغیر واقع ہوتا ہے، قرآن انہیں ایمان کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ

(اور پھر، چونکہ قوم افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے اسی لیے یہی قانون آگے بڑھ کر اقوام کو بھی محیط ہو جاتا ہے۔ اس قانون کا نتیجہ ہے کہ) خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے یعنی اپنے اندر قلبی اور ذہنی تبدیلی پیدا نہ کرے۔

وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

(چنانچہ جس طرح یہ ایک محکم اصول ہے کہ زندگی کی جو خوشگواریاں کسی قوم کو حاصل ہوں وہ اس سے نہیں چھنتیں جب تک وہ ان کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے (۱۳/۵)، اسی طرح) یہ بھی ایک غیر متبدّل قانون ہے کہ جب کسی قوم پر اس کے اعمال کے نتیجہ میں، تباہی آتی ہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ ہی اس قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر وہ پھر قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرلے تو وہ اس کی مدد کر سکتا ہے۔

نفسیاتی تغیرات سے جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ انسان کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ بجز اس کے کہ کوئی قوم نفسیاتی تغیر کی صلاحیتوں ہی کو معدوم کر چکی ہو، اس کے لیے تغیرِ احوال کا امکان ہے۔ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ نے نگاہ کا رُخ، دوبارہ زندگی حاصل کر سکنے کی اُمید کی طرف موڑ دیا اور اس کے لیے پھر مظاہرِ کائنات کی مثال سے اس بسیط حقیقت کو سمجھا دیا۔ فرمایا:

(۱۳—۱۲—۱۳) هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

(تباہیوں کی ایسی یاس انگیز حالت میں، قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنے کی امید افزا کیفیت کا اندازہ کرنے کے لیے تم پھر کائنات میں غور کرو کہ ایک ہی حادثہ میں کس طرح، بیم و رجا، ملے جلے ساتھ آتے ہیں، تم دیکھو کہ بجلی چمکتی ہے تو اس سے خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی، پانی سے بھرے ہوئے بادل اُمنڈے چلے آتے ہیں جو تمہارے لیے نفع بخشیوں کے پیغام بر ہوتے ہیں۔

ان بادلوں کی گرج بلکہ تمام کائناتی قوتیں، قانونِ خداوندی کی ہیبت سے لرزہ براندام، اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل رہتی ہیں تاکہ اُس کی ربوبیت اس طرح نکھر کر سامنے آجائے کہ ہر دیکھنے والے کی زبان پر بے ساختہ کلماتِ تحسین آجائیں (۱/۱)۔ باقی رہیں بجلیوں کی تباہ کاریاں، تو وہ اُس پر گرتی ہیں جو اُن کی زد میں اپنا آشیانہ بنا کر خود تباہ ہونا چاہتا ہے اور یہ کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ لوگ (اس قدر زندہ شہادتوں کے باوجود) قانونِ خداوندی کے بارے میں تجھ سے جھگڑا کرتے ہیں (اور نہیں

سمجھتے کہ خدا کا جو قانون، کائنات میں یہ کچھ کر رہا ہے وہ) انسانی دنیا میں بھی کس قدر سختی سے مواخذہ کرنیوالا ہے۔
لیکن یہ امن و امان، یہ خوشحالیاں اور سرابیاں بیٹھے بٹھائے اور محض زبانی یا اللہ یا اللہ کہہ دینے سے حاصل نہیں ہو جاتیں۔ اس کے لیے اُس خدا کے قوانین کا اتباع ضروری ہے جس کے قوانین کی خلاف ورزی سے تباہیاں آتی ہیں۔

۱۳/۱۴ لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ ط وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ط وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

(اس لیے جو قوم یہ چاہتی ہے کہ اس کی کوششیں ٹھوس تعمیری نتائج پیدا کریں، اُسے اُس کے قوانین کا اتباع کرنا چاہیے اس لیے کہ) ٹھوس، تعمیری نتائج پیدا کرنے والی ہر بانگ اُس کے قانون سے وابستہ ہے۔ جو لوگ یہ چاہیں کہ اس کے قانون کو چھوڑ کر کسی اور کے قانون کی رُو سے تعمیری نتائج پیدا کرلیں تو اُن کی یہ آرزو اور کوشش اسی طرح رائیگاں جائے گی جس طرح اُس شخص کی آرزو اور کوشش رائیگاں جاتی ہے جو دُور سے پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر سمجھے کہ پانی اس کے منہ تک خود بخود پہنچ جائے گا۔ حالانکہ اس طرح پانی اُس کے ہونٹوں تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ (یہ چیز قانونِ خداوندی کے خلاف ہے) لہٰذا اس کے قانون سے انکار کرنے والوں کی آرزوئیں کبھی بار آور نہیں ہو سکتیں۔ (۴۰/۱۴۳)

اس ضمن میں انڈکس میں دعا اور جنت کے عنوانات بھی دیکھئے۔ اس کے بعد پھر مظاہرِ فطرت کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ فرمایا:

۱۳/۱۵ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾

(یہ لوگ جو ہمارے قانون سے انکار کرتے ہیں، دیکھتے نہیں کہ) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کوئی ہے "طَوْعًا وَّ كَرْهًا" ہمارے قانون کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہے[1] (۳/۸۳ ؛ ۱۶/۴۹) اگر یہ لوگ کائنات کی بڑی بڑی چیزوں کو دیکھنا نہیں چاہتے تو، کم از کم اپنے جسم پر ہی غور کریں جو خدا کے قانونِ طبیعی کے تابع ہے۔ وہ دیکھیں کہ) ان کا سایہ کس طرح،

---

[1] اس کی تشریح کے لیے (۳/۸۳) دیکھئے۔

صبح سے دوپہر تک ایک سمت میں اور دوپہر سے شام تک دوسری سمت میں رہتا ہے۔ (کیا انہیں اس پر اختیار ہے کہ وہ اس سایہ کی سمت کو بدل دیں؟ یہ لوگ یہاں تک تو مانیں گے کہ اس کے بدلنے پر انہیں اختیار نہیں لیکن اسے تسلیم نہیں کریں گے کہ خدا کا قانون ان کے سایہ سے آگے بڑھ کر، ان کی ذات پر اور انسانی معاشرہ پر بھی نافذ ہوتا ہے)۔

اشیائے کائنات کی طوعًا و کرھًا سجدہ ریزی کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد چہارم کے صفحہ ۱۶۶-۱۶۷ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اسے ایک نظر دوبارہ دیکھ لیا جائے۔ آیت زیرِ نظر میں البتہ ظلال (سایوں) کی جو مثال دی گئی ہے وہ بڑی عمیق حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کی اطاعت بہرحال کرتی ہے۔ اس سے خلاف ورزی کا کسی کو اختیار نہیں۔ انسان صاحبِ اختیار ہے لیکن جہاں تک اس کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے وہ بھی قوانینِ فطرت کی اطاعت پر مجبور ہے۔ (مثلاً) سانس پر اُس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اُسے اس کا تو اختیار ہے کہ سانس لے یا نہ لے لیکن اُسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ سانس بند کرلے اور پھر بھی زندہ رہے[1] یہاں وہ دیگر جانداروں کی طرح مجبور ہے۔ اس جبر و اختیار کی ایک بیّن مثال اس کا سایہ ہے۔ ایک شخص کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ دائیں طرف جائے یا بائیں طرف۔ آگے کی طرف چلے یا پیچھے کی طرف۔ لیکن اُسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ اپنے سایے کا رُخ بھی اپنی مرضی کے مطابق متعین کرلے۔ اس کا رُخ فطرت کا قانون مقرر کرتا ہے جس کے بدلنے پر اس کو کوئی اختیار نہیں۔

خدا کا یہی قانون اس کی انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ اُسے اس کا تو اختیار حاصل ہے کہ وہ اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے یا ان کی خلاف ورزی کرے۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ زندگی تو اقدار و قوانینِ خداوندی کے خلاف بسر کرے اور وہ تباہیاں جو اس خلاف ورزی کا نتیجہ ہوں، انہیں آنے نہ دے۔ روک لے۔ بالفاظِ دیگر اسے اپنے اعمال پر تو اختیار ہے، اعمال کے نتائج بدلنے پر نہیں۔

اقدارِ خداوندی پر ایمان نہ رکھنے والوں (سیکولرازم کے پیروکاروں) کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ صرف کائناتی قوانین کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، اپنی داخلی زندگی سے متعلق قوانینِ خداوندی کو تسلیم نہیں کرتے۔

۱۳/۱۴ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ

---

[1] یہ جو جوگیوں، سنیاسیوں کے "حبسِ دم" کے واقعات سامنے آتے ہیں یہاں اُن سے بحث مقصود نہیں، انسان کی عام زندگی کی مثال پیش کی جانی مقصود ہے۔

مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۤءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڏ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ڗ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۤءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

(ان کی اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ) اگر تم ان سے پوچھو کہ خارجی کائنات (زمین و آسمان) میں کس کا قانون کارفرما ہے، تو جس طرح تم کہتے ہو، یہ بھی کہہ دیں گے کہ وہاں اللہ ہی کا قانون نافذ العمل ہے (۲۳/۸۴-۹۰؛ ۲۹/۶۱-۶۳) ان سے کہو کہ پھر تم اپنی داخلی دنیا میں (اس کے قانون کو چھوڑ کر) دوسری قوتوں کو کیوں کارساز بناتے ہو جن کی بےبسی کا یہ عالم ہے کہ وہ (دوسروں کے لیے تو ایک طرف) خود اپنی ذات کے لیے بھی نفع اور نقصان کی قدرت نہیں رکھتیں — تم جب خدا کو "اِلٰـهٌ السَّمَآءِ" مانتے ہو تو اُسے "اِلٰـهُ الْاَرْضِ" کیوں نہیں مانتے۔ (۴۳/۸۴؛ ۲۱/۲۱-۲۲)

اِن دلائل کے بعد ان سے پوچھو کہ کیا اندھا اور دیکھنے والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ یا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اندھیرا اور اُجالا یکساں ہو جائے؟ (۱۱/۲۴؛ ۳۵/۱۹)

یا ان سے پوچھو کہ انہوں نے جن ہستیوں کو خدا کی کارسازی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے، کیا انہوں نے بھی خدا کی مخلوق کی طرح کوئی مخلوق پیدا کی ہے اور ان دونوں کی مخلوق ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے جس سے یہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ خدا یگانہ نہیں، اُس جیسے اور بھی ہیں۔

ان سے کہو کہ ان کا یہ خیال باطل ہے۔ ہر شے کا خالق صرف خدا ہے۔ وہ بےمثل اور یگانہ ہے اور تمام قوتوں کا واحد مالک اور سب پر غالب۔

مفہوم میں جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان پر غور کرنے سے حقائق اور بھی واضح ہو جائیں گے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن ہر شخص کے اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا کو ماننے کو ایمان باللہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ اس ایمان کو ایمان باللہ تسلیم کرتا ہے جو اُس خدا پر ہو جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے۔ اس کی تفصیلی بحث مطالبُ الفرقان جلد اوّل صفحہ پر گزر چکی ہے۔



کائنات میں خیر کے ساتھ شر بھی ہے۔ یعنی تعمیری قوتوں کے ساتھ تخریبی قوتیں بھی۔ جن مسائلِ حیات کا صحیح مفہوم

سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان غلط نگہی بلکہ گمرہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان میں ایک اہم مسئلہ "خیر و شر" کا بھی ہے۔ اس سے جو اُلجھن پیدا ہوتی ہے اُسے فلسفہ کی زبان میں سینٹ تھامس کا معمّہ (ENIGMA) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ اُلجھاؤ یہ ہے کہ اگر شر (EVIL) خدا کا پیدا کردہ ہے اور اس کی مرضی سے کارفرما رہتا ہے تو خدا خیرِ مطلق نہیں۔ اگر وہ خدا کی مرضی کے علی الرغم سرگرمِ عمل رہتا ہے تو خدا قادرِ مطلق نہیں۔ یہ اُلجھن خیر و شر کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

کائنات میں سلسلۂ ارتقاء جاری و ساری ہے۔ نظریۂ ارتقاء کا ملخص یہ ہے کہ زندگی جس پیکر یا جس مرحلہ میں بھی ہے اُس کا ٹکراؤ مخالف قوّت سے ہوتا ہے۔ اگر اس نوع میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیّت اور قوّت ہے تو وہ مخالف قوّت پر قابو پاکر آگے بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایسی قوت نہیں تو مخالف قوّت سے مغلوب ہو کر معدُوم ہو جاتی ہے اور اگر ایسا ہے کہ مخالف قوّت سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا تو وہ جامد ہو جاتی ہے۔

مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں کشمکش حق و باطل، نظریۂ ارتقاء، ابلیس یا شیطان کے عنوانات کے تابع اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مقامات کا مطالعہ اس سوال کو سمجھنے میں ممد و معاون ہوگا۔ بانگِ درا میں ارتقاء کے عنوان سے علاّمہ اقبالؒ کی جو نظم درج ہے اس میں اس ٹکراؤ کی وضاحت بڑے دلکش انداز میں کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز　　سرشت اُس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی　　ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی!
کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش　　زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید　　میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی!
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام　　یہی ہے رازِ تب و تابِ ملّتِ عربی

"مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند"

قرآنِ کریم میں شر یا تخریبی قوّتوں کو ابلیس یا شیطان کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (سابقہ جلدوں میں اس کی وضاحت بھی آچکی ہے)۔ عبرانی زبان میں شیطان کے معنی (HINDERER) کے ہیں۔ یعنی رکاوٹ پیدا کرنے والا۔ اس

میں ٹکراؤ اور تصادم کا مفہوم واضح ہے۔ ابلیس بھی اقبالؒ کا خاص موضوع ہے۔ وہ زندگی کے فروغ اور ارتقاء کے لیے اس تصادم کو اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ کہتے ہیں ؎

مزی اندر جہانِ کور ذوقے که یزداں دارد و شیطاں ندارد

یہ دراصل تصوّف کے مسلک پر تنقید ہے جس میں "نفس" کے فنا کر دینے کو مقصدِ حیات قرار دیا جاتا ہے۔

دوسری طرف وہ مومن بھی اُسے قرار دیتے ہیں جس میں ابلیس کے ساتھ ٹکر لینے اور اُسے مغلوب کرنے کی صلاحیت اور قوت ہو۔ اقبالؒ کو موجودہ مسلمانوں کے خلاف شکایت یہ ہے کہ ان میں شر کی تخریبی قوتوں (باطل) کے ساتھ ٹکر لینے کی ہمت ہی نہیں۔ وہ اس حقیقت کو جاویدنامہ میں ایسے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ ابلیس بحضور ربُّ العزّت فریاد کرتا ہے کہ اگر تیری یہ مخلوق اس قدر دوں ہمت، بزدل اور کمزور تھی تو مجھے اس قدر بے پناہ قوت دینے کی ضرورت کیا تھی! اخروٹ توڑنے کے لیے (ROAD ROLLER) تو درکار نہیں ہوتا! وہ کہتا ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ ؎

صَید خود صیاد را گوید بگیر الاماں از بندۂ فرماں پذیر!

اس کے بعد وہ کہتا ہے: ؎

آنچناں تنگ از فتوحات آمدم پیشِ تو بہرِ مکافات آمدم

یہ ہے مصافِ زندگی میں تصادم کی اہمیت۔ آپ انڈکس میں جنّت کا عنوان بھی دیکھئے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ جنّت کی راہ کس قدر صبر آزما، ہمّت طلب، لرزہ انگیز، خارہ شگاف تصادمات سے پٹی پڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں قوتیں پیدا کیں اور انسان کو اس کی صلاحیت عطا کر دی کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کرے اور اس کا اختیار بھی کہ وہ انہیں جس مقصد کے لیے چاہے استعمال کرے۔ اگر وہ ان قوتوں کو (جن میں اس کی اپنی قوتیں بھی شامل ہیں) وحیٔ خداوندی کی روشنی میں تعمیری مقاصد کے لیے صرف کرتا ہے تو یہ قوتیں بھی خیر بن جاتی ہیں اور انسان کا یہ عمل بھی عملِ خیر۔ اس کے برعکس۔ اگر وہ انہیں تخریبی مقاصد کے لیے صرف کرتا ہے تو یہ قوتیں شر بن جاتی ہیں اور انسان کے یہ کام بھی شر۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے شر کو پیدا نہیں کیا۔ اس نے صرف قوتوں اور صلاحیتوں کو پیدا کیا ہے۔ یہ انسان ہے جو انہیں شر بنا دیتا ہے۔ خدا نے وحی کی راہ نمائی مرحمت فرمائی جو سرتاسر خیر کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لیے مومن کی زبان سے کہلوایا کہ بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔ (۳/۲۶)۔ "تو خیر ہی خیر عطا کرتا ہے"۔ شر ہم پیدا کر لیتے ہیں۔ میں نے اس نکتہ پر اپنی "لغات القرآن" میں بھی بحث کی ہے۔ مناسب معلوم

ہوتا ہے کہ متعلقہ اقتباس یہاں درج کر دیا جائے۔

"سُورۃ الفلق" میں مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۱۱۳/۲) سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ یعنی جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اُس کے شر سے حفاظت۔ اس سے ظاہر ہے کہ شر (EVIL) کوئی مستقل بالذات شے نہیں جسے الگ پیدا کیا گیا ہو (جیسا کہ مجوسیوں کے ہاں عقیدہ تھا)۔ کائنات کی کوئی شے نہ بجائے خویش شر ہے نہ خیر۔ ہر چیز میں شر کا پہلو بھی ہے اور خیر کا بھی۔ اس کے شر کے پہلو سے بچنا چاہیئے اور خیر کا پہلو اختیار کرنا چاہیئے۔ پانی اگر کشتی کے نیچے رہے تو خیر ہی خیر ہے لیکن اگر وہ کشتی کے اندر آجائے تو شر ہو جائے گا۔ کائنات کی ہر قوت کو وحیٔ خداوندی کی روشنی میں صرف اور استعمال کرنا، خیر ہے اور اسے انسانیت کی تخریب کے لیے استعمال کرنا شر۔" (لغات القرآن، جلد دوم، صفحہ ۹۴۰)

ان تصریحات کی روشنی میں سورۃ الرّعد کی آیت ۱۳/۱۷ کی طرف آیئے۔

(۱۳/۱۷) اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ؕ ﴿۱۷﴾

(اب رہی یہ بات کہ اگر کائنات میں سب کچھ اُسی کا پیدا کردہ ہے تو پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ یہاں صاف اور ستھرے پانی کے ساتھ خس و خاشاک بھی ہے اور خوشگواریوں کے ساتھ ناخوشگواریاں بھی۔ خیر کے ساتھ شر بھی ہے اور حق کے ساتھ باطل بھی؟ ان سے کہو کہ یہ اس لیے ہے کہ یہاں حق و باطل کی کشمکش کا قانون کارفرما ہے۔ اور اس کشمکش سے کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی، آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ) وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے تو ندی نالے، اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔ پانی کے بہاؤ سے، زمین کا میل کچیل جھاگ بن کر زمین کی سطح پر آجاتا ہے تو سیلاب کی رَو اسے بہا کر لے جاتی ہے (اور زمین صاف ستھری رہ جاتی ہے)۔ یا یوں سمجھو کہ جب کسی دھات کو آگ میں تپایا جاتا ہے تاکہ اس سے زیورات یا دیگر ضروریات کی چیزیں

بنائی جائیں تو اس کا کھوٹ، جھاگ بن کر اوپر آجاتا ہے (اور خالص دھات نیچے رہ جاتی ہے)۔

اسی طرح کائنات میں خدا کے قانونِ کشمکش کے مطابق تعمیری قوتیں، تخریبی قوتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں تو تخریبی قوتیں جھاگ کی طرح رائیگاں چلی جاتی ہیں اور جو کچھ نوعِ انسان کے لیے نفع بخش ہوتا ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ محو و ثبات۔ (۱۳/۳۹ ; ۱۷/۸۱ ; ۲۱/۱۸)

اِن تصریحات کی روشنی میں جو پہلے پیش کی گئی ہیں، آیت کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ (اس کو آیت ۱۳/۳۹ میں قانونِ محو و ثبات سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ ویسے بھی یہ آیت مطالبُ الفرقان، جلد سوم، صفحہ ۲۰۰ پر کشمکش حق و باطل کے ضمن میں آچکی ہے۔ مزید وضاحت وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

لیکن آیت کے آخر میں جو بُنیادی اصول بیان کیا گیا ہے وہ دین کا ملخص، اِسلام کا منتہیٰ اور انسانی اعمال کے پرکھنے کی صادق ترین کسوٹی ہے۔ فرمایا کہ

بقا اس عمل کے لیے ہے جو نوعِ انسان کے لیے منفعت بخش ہے۔

جس قدر کوئی نظریہ، کوئی نظام، کوئی عمل نوعِ انسان کے لیے منفعت کا باعث ہے، اسی قدر اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہے۔ بقا اسی کے لیے ہے۔ یہ ایسی کسوٹی ہے جس سے پرکھ ہو جاتی ہے کہ انسان کے کون سے اعمال 'اعمالِ صالحہ، حسنات' باعثِ ثواب یعنی "نیک" ہیں۔ وہی جو دوسرے انسانوں کے لیے نفع بخش ہیں۔ بقا سے مراد یہ ہے کہ وہ اس زندگی میں بھی موجبِ بقا ہیں اور اگلی زندگی میں بھی باقی رہنے والے۔ اس قدر مختصر الفاظ میں ایسا بلند اصُول قرآن ہی پیش کر سکتا تھا۔

پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ "مَا يَنْفَعُ النَّاسَ" کہا ہے۔ یعنی وہ کام جو کسی خاندان، خاص قبیلہ، خاص برادری، حتیٰ کہ کسی خاص قوم کے لیے نفع بخش نہیں بلکہ جو عالمگیر انسانیت کے لیے نفع بخش ہو۔

یہ ہے دین کا مقصود و مدّعا۔ یہ ہے اسلام کا مطلوب و منتہیٰ۔ یہ ہے اِسلامی نظام کے قیام کی ضرورت اور یہ ہے اسلامی مملکت کی تشکیل کی وجہِ جواز۔ یہ ہے امتِ مسلمہ کی بعثت کی غرض و غایت۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ (۳/۱۱۰) تم وہ امتِ خیر بدست ہو جسے نوعِ انسان کی منفعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کیا انسانوں کا وضع کردہ کوئی نظام اس مقامِ بلند کو چھو بھی سکتا ہے؟ اور کیا کوئی اور نظام امنِ عالم کا ضامن ہو سکتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ قرآنِ عظیم کے اس عالمگیر زرّیں اصول کو ہر ایوانِ حکومت کے دروازے پر منقوش اور ہر محرابِ مسجد پر کندہ ہونا چاہیئے۔ مغربی سیاست دانوں نے قانونِ ارتقاء "بقاء للاصلاح" بنایا تھا مگر قرآن نے وہ اصول "بقاء للانفع" بنایا۔ اصلح اپنی ذات کے لیے ہے۔ انفع عالمگیر انسانیت کے لیے۔ ع

عقلِ خود بیں دیگر و عقلِ جہاں بیں دیگر است

حق و باطل کی کشمکش کا یہی اصول قوموں میں بھی کارفرما ہے۔ اس تقسیم کے اعتبار سے، گروہ دنیا میں دو ہی رہ جاتے ہیں۔ ایک وہ جو "مَا يَنْفَعُ النَّاسَ" کے مسلک پر کاربند ہو، دوسرا وہ جو اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرے۔

۱۳/۱۸ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٨﴾

اس طرح خدا، مثالوں کے ذریعے بات واضح کر دیتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو خدا کی دعوت پر نہایت حسن کارانہ انداز سے لبیک کہتے ہیں۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ جس دعوت کو لے کر وہ اٹھے ہیں اس میں کس طرح تخریبی قوتوں سے تصادم ہوگا اور بالآخر کس طرح حق کی کامیابی ہوگی۔

باقی رہے وہ لوگ جو اس دعوت پر لبیک نہیں کہتے (بلکہ اس کی مخالفت کرتے ہیں، تو ان سے کہہ دو کہ قانونِ خداوندی کی رو سے ان کی تباہی یقینی ہے۔ آج تو اُن کے لیے موقعہ ہے کہ وہ اس دعوت کو تسلیم کر کے اس تباہی سے بچ جائیں۔ لیکن اگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور ظہورِ نتائج کا وقت آ گیا تو اس وقت) اگر ایسا ہو کہ ان کے پاس تمام رُوئے زمین کی دولت ہو اور اس کے ساتھ اتنی ہی دولت اور جمع ہو جائے اور وہ چاہیں کہ اس تمام دولت کو دے کر اس تباہی سے بچ جائیں تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس وقت ان کے اعمال کا حساب، اُن کے حق میں بہت بُرا ہوگا اور ان کا ٹھکانا تباہیوں کا جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

یہ دو گروہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

۱۳/۱۹ أَفَمَن يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿١٩﴾

ذرا سوچو کہ ایک شخص وہ ہے جو اس پر یقین رکھتا ہے کہ جو کچھ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے نازل ہوا ہے وہ حق

ہے اور دوسرا وہ ہے جو اس حقیقت کی طرف سے بالکل اندھا ہے۔ کیا یہ دونوں کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟
لیکن ان مثالوں سے انہی لوگوں کے سامنے حقیقت آسکتی ہے جو عقل و دانش سے کام لیں۔

لیکن وہ عقل نہیں جو "سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر"۔ اقبالؒ، اس عقل کو جو انفرادی مفاد کے حصول کے لیے کوشاں اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے ساعی ہو، "عقلِ خود بیں" کہہ کر پکارتا ہے اور اس عقل کو جو ما ینفع الناس کی علمبردار ہو، "عقلِ جہاں بیں"۔ اسی عقل کے حامل ہیں جن کی قرآن ان الفاظ میں خصوصیت بیان کرتا ہے۔

۱۳/۲۰ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ ﴿٢٠﴾

وہ عقل و دانش نہیں جو جذبات کے تابع جبلتی اور انفرادی مفاد پرستیوں کی راہیں دکھاتی ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی عقل و دانش جو اس عہد کو پورا کرتے ہیں جو انہوں نے اللہ سے باندھ رکھا ہے (۹/۱۱۱) اور اپنے اقرار کو کبھی نہیں توڑتے۔

اس کے ساتھ:

۱۳/۲۱ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾

جو انسانیت کے ان ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتے ہیں جن کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا (۲/۲۷)۔ اس لیے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔

یہاں ان کی ایک اہم خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ "انہیں ملاتے ہیں جنہیں ملانے کا خدا نے حکم دیا ہے"۔ سورۃ البقرہ میں (اس کے برعکس)، فاسقین اور مفسدین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ انہیں توڑتے ہیں جنہیں جوڑنے کا حکم خدا نے دیا ہے (۲/۲۷) نیز (۱۳/۲۵)۔ اس کی وضاحت سورۃ البقرہ کی آیت (۲/۲۱۳) اور سورۃ یونس کی آیت (۱۰/۱۹) میں کر دی گئی۔ مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۲۰۲ پر) دیکھیے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ منشاءِ خداوندی تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کی شکل میں منسوط کرنا ہے۔ ابتداءً تمام انسان ایک اُمت، ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہوگئے تو یہ مختلف قبائل اور مختلف اقوام اور پھر ایک قوم کے اندر مختلف ذاتوں، برادریوں یا مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کی شکل میں بٹ گئے۔ وحیِ خداوندی کا مقصود، نوعِ انسان کے ان تمام تفرقات کو مٹا کر پھر سے ایک عالمگیر برادری کی شکل میں امتِ واحدہ بنانا تھا۔ اس کی ابتداء اس قوم (جماعتِ مومنین) سے کی گئی جسے امتِ مسلمہ کہہ کر پکارا گیا۔ اس کا فریضہ تھا کہ وہ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر کے، عالمِ انسانیت کو اس دائرے کے اندر سمو لے۔ یہی اسلام کا منتہیٰ اور دین کی غایت تھی۔

لیکن اس اُمّت نے کیا کیا؟ بجائے اس کے کہ نوعِ انسان کے اختلافات ختم کرکے انہیں ایک عالمگیر برادری کی شکل دیتی، خود ہی مختلف قوموں، فرقوں، برادریوں، پارٹیوں میں بٹ گئی اور جس جہنّم میں غیر مسلم عذاب کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس کو خود اپنے اوپر وارد کر لیا۔ آپ انڈکس میں فرقہ، تفرقہ جیسے عنوانات دیکھئے۔ قرآن نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ سو جو قوم خود شرک میں مبتلا ہو وہ وحدتِ انسانیت کی علمبردار کیسے بن سکتی ہے؟ یاد رکھئے، اسلام، انسانیت کے رشتوں کو جوڑنے کا نام ہے، توڑنے کا نہیں۔ بلالحاظ رنگ، نسل، زبان، وطن، صرف ایمان کے اشتراک سے ایک عالمگیر انسانی برادری کی تشکیل۔ اس سے انسان اس عذاب سے نجات حاصل کر سکے گا جس میں وہ بُری طرح ماخوذ ہے۔

لیکن اقوامِ عالم اپنے گروہ بندانہ مفادات کو آسانی سے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں گی۔ اس کے لیے جہدِ مسلسل کی ضرورت ہوگی جس کی راہ میں بڑے بڑے صبر آزما مراحل آئیں گے۔ اس لیے یہ مسافت بڑے ثبات و استقامت کی متقاضی ہوگی۔ موجودہ مسلمان اگر اس منشاءِ خداوندی کو پُورا کرنا چاہیں گے تو اُنہیں سب سے پہلے اپنے ہاں کی مذہبی فرقہ بندی کو ختم کرکے، خود اُمّتِ واحدہ بننا ہوگا۔ پھر مسلمان ممالک اور اقوام کو حبل اللہ (قرآن) کے رشتے میں پرو کر اُمّتِ مسلمہ میں وحدت پیدا کرنا ہوگی۔ اس کے بعد عالمگیر انسانیت کی وحدت کا مرحلہ آئے گا۔ اس کا عملی پروگرام — نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ انفاق (نظامِ ربوبیت) کا قیام ہے۔ (انڈکس میں صلوٰۃ۔ انفاق۔ ربوبیّت۔ رزق وغیرہ کے عنوانات بھی دیکھیئے۔)

۱۳/۲۲ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

جو اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لیے، جو اُن کے پروردگار نے اُن کے لیے متعیّن کر رکھا ہے، نہایت ثبات و استقامت سے سرگرمِ عمل رہتے ہیں اور نظامِ صلوٰۃ متشکل کرتے ہیں اور جو سامانِ نشوونما انہیں دیا جاتا ہے — خواہ ان کی مضمر صلاحیتیں ہوں یا محسوس سامانِ زیست — اسے نوعِ انسان کی بہبود کے لیے، حسبِ ضرورت خفیہ یا اعلانیہ صَرف کرتے ہیں اور یوں، معاشرہ کی ناہمواریوں کو، اپنے حسنِ عمل سے دور کرتے ہیں (۲۸/۵۴؛ ۲۳/۹۶)۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا انجام نہایت خوشگوار ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس امت سے اس پروگرام کی ابتداء کرنے کو کہا جا رہا ہے اس میں تو خود صدہا

خرابیاں ہیں۔ پہلے ان کا ازالہ ضروری ہے۔ اس کا طریقہ قرآنِ حکیم نے خود ہی بتا دیا ہے۔ وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ. یعنی تخریبی کاموں کے نقصانات کا ازالہ اس طرح ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کیے جائیں۔ یہ ایک عظیم اصول ہے۔ اس کا مفہوم توبہ کے عنوان سے بھی سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی واضح تشریح سورۃ ھود کی آیت (۱۱/۱۱۴) میں ملے گی جہاں کہا گیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴) حسنات، سیّئات کو بہا کر لے جاتی ہیں برائیوں کا ازالہ اچھائیوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ افراد ہی نہیں بلکہ معاشرہ کی اصلاح کے لیے بھی یہ اصول اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا انجام نہایت خوشگوار ہے۔

(۱۳ ۲۳—۲۴) جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے اس گھر (دنیاوی زندگی) کا انجام نہایت اچھا ہے۔ یعنی جنّتی معاشرہ جس میں وہ داخل ہوں گے — وہ بھی اور اُن کے ماں باپ۔ بیویاں اور اولاد بھی، بشرطیکہ اُن کے اعمال صالح ہوں جن سے وہ اس زندگی کے اہل قرار پا چکے ہوں اور ان پر چاروں طرف سے ملائکہ کا نزول ہوگا۔ (۴۱/۳۰)

جو یہ خوشخبریاں لیتے آئیں گے کہ تمہارے لیے ہر طرح امن اور سلامتی ہے۔ اس لیے کہ تم نے نہایت استقامت اور استقلال سے مشکلات کا مقابلہ کیا۔ سو دیکھو کہ اس جدوجہد کے بعد، تمہاری زندگی کا انجام کیسا خوشگوار ہوا۔

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ جنّتیوں کے رشتے دار (ماں باپ۔ بیوی بچے) محض اُن کے رشتہ دار ہونے کی بنا پر جنّت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ ان کے اعمال صالح ہوں۔ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے کسی بڑے سے بڑے کے ساتھ بھی رشتہ داری کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ فیصلہ ہر ایک کے اپنے ذاتی اعمال کی رُو سے ہوگا۔ مَوَدَّةً فِي الْقُرْبٰى (۴۲/۲۳) کے متعلق تفصیلی بحث مطالبُ الفرقان، جلد پنجم (صفحہ ۶۷۔۶۸) میں گزر چکی ہے۔ سورۃ ھود میں دیکھئے۔ ہر رسول نے اپنی دعوت کا آغاز اس اعلان کے ساتھ کیا تھا کہ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (۱۱/۵۱ وغیرہ) میں تم سے کوئی اجرِ رسالت نہیں مانگتا۔ اس کا اعادہ متعدد دیگر مقامات میں بھی کیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ بلا اجر کی اہمیت اس قدر ہے کہ کہا گیا اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۶/۲۱) جو لوگ راہِ راست پر ہوں اور تم سے کوئی اجر بھی نہ مانگتے ہوں، ان کا اتباع کرو۔

مومنین پر نزولِ ملائکہ کے متعلق دیکھئے (۱۶/۳۲)۔
اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو ان کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں۔

۱۳/۲۵ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

ان کے برعکس، وہ لوگ ہیں جو اس عہد کو جو انہوں نے خدا کے ساتھ نہایت مضبوطی سے باندھا تھا، توڑ ڈالتے ہیں اور انسانیت کے جن رشتوں کو جوڑنے کا اُس نے حکم دیا تھا انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں (۲/۲۷ اور ۱۳/۲۱) اور اس طرح دنیا میں فساد اور ناہمواریاں برپا کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں اور ان کا انجام بڑا ہی خراب ہوتا ہے۔

چونکہ یہ ضد ہے پہلی روشِ زندگی کی، اس لیے اس کی الگ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ قرآنِ کریم کا یہ عام انداز ہے کہ وہ اضداد کے تقابل سے اپنے مقصد کی وضاحت کرتا ہے اور یہ انداز بڑا بلیغ بھی ہوتا ہے اور موثر بھی۔ بقول غالبؔ۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا ہو نہیں سکتی!

اُوپر کہا گیا ہے کہ جو لوگ مشیّت کے پروگرام کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں، ان کا انجام تباہ کُن ہوتا ہے۔ اس پر عام طور پر ذہنوں میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے متموّل اور خوشحال ہوتے ہیں اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

۱۳/۲۶ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

یاد رکھو! دنیا میں سامانِ معیشت خدا کے قانون کے مطابق ملتا ہے۔ جو فراواں لینا چاہے اور (اس کے لیے کوشش کرے تو اسے) فراواں مل جائے گا۔ جو نپا تُلا لینا چاہے اُسے نپا تُلا ملے گا۔ (یہ سب خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق ہوتا ہے۔ جو شخص اس قانون کے مطابق کھیتی میں زیادہ محنت کرتا ہے اس کی فصل اچھی ہوتی ہے (۱۷/۱۸-۲۱)۔ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ جو لوگ انسانیت کے رشتوں کو منقطع کر دیتے ہیں، ان کا انجام خراب ہوتا ہے۔ تو یہ وہ لوگ

ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ لہٰذا وہ اسی دنیا کے مفاد کو نصب العین قرار دے لیتے ہیں اور اسی میں مگن رہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اگر انسان کا مستقبل (اُخروی زندگی) تاریک رہے تو اس زندگی کی خوشحالی کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ (۲/۲۰۰-۲۰۱)

دنیا اور آخرت کی خوشگواریوں کا تقابل قرآنِ حکیم کا اہم موضوع ہے اور ہم نے مختلف مقامات پر اس کی تشریح کی ہے۔ مثلاً مطالبُ الفرقان، جلد سوم (صفحہ ۲۵۴) اور وہاں دیئے گئے دیگر حوالے۔ علاوہ ازیں سورۃ بنی اسرائیل کی آیت (۱۸-۲۱) میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ ان مقامات میں اس اصول کو سامنے لایا گیا ہے کہ جہاں تک طبعی زندگی کے مفادات کا تعلق ہے، جو شخص بھی طبعی قوانینِ کائنات کے مطابق کوشش کرے گا اُسے اس کا ثمر مل جائے گا۔ اس میں مؤمن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ یہ تمیز اس مقام پر سامنے آتی ہے جہاں ان ثمرات اور مفادات کے استعمال کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ اگر ان کا استعمال اقدار و اصولِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ اس دنیا میں عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود اور اُخروی زندگی کی خوشگواریاں ہوتا ہے۔ اگر ان کا استعمال ان کے خلاف ہوتا ہے تو یہ دنیا بھی جہنم بن جاتی ہے۔ اور اُخروی زندگی کا جہنم تو بہرحال موجود ہی ہے۔



قرآنِ حکیم اپنے دعاوی کو دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ ان پر علم و بصیرت کی روشنی میں غور کیا جائے اور ان کی صداقت کو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ لیکن انسانیت کے بچپن کا ذہن (اور انسانوں کی معتد بہ اکثریت ہنوز عہدِ طفولیت ہی میں زندگی بسر کر رہی ہے) عجائبات اور فوق الفطرت طلسمات کا خوگر ہے۔ اس لیے وہ حضرات انبیاء کرامؑ کے دعاوی کے جواب میں ان سے معجزات کا مطالبہ کرتا چلا آیا ہے۔ عہدِ نبی اکرمؐ میں بھی یہی ماجرا پیش آیا۔ مخاطبین نے معجزات کا مطالبہ کیا اور لسانِ وحی نے اس سے انکار کرتے ہوئے بتایا کہ اس انکار اور استرداد کی وجہ کیا ہے۔ آپ انڈکس میں "معجزات" کا عنوان دیکھئے۔ متعدد مقامات آپ کے سامنے آجائیں گے۔ اس سورۃ میں چند صفحات پہلے، آیت (۱۳/۷) کے تحت بھی یہ بحث آچکی ہے۔ یہاں پھر اس اعتراض کو سامنے لایا گیا ہے۔

۱۳/۲۷ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴿٢٧﴾

(اب پھر اُسی اعتراض کی طرف آؤ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے (۱۳/۷)، یعنی) یہ لوگ جو اس ضابطۂ خداوندی کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس رسول کو اس کے نشوونما دینے والے کی طرف سے کوئی (محسوس) نشان (معجزہ) کیوں نہ ملا؟

ان سے کہہ دو کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ غلط اور صحیح راستہ پر چلنا انسان کے اختیار و ارادے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لہٰذا جو شخص غلط راستے پر چلنا چاہے گا، قانونِ خداوندی اُسے غلط راستے پر چلنے دے گا۔ اُسے اُس راستے سے موڑ کر زبردستی صحیح راستے کی طرف نہیں لائے گا۔ اور جو شخص صحیح راستے کی طرف رجوع کرے گا اُسے خدا کا قانون صحیح راستے پر چلنے دے گا (یہی وجہ ہے کہ خدا کی طرف دعوت علیٰ وجہ البصیرت پیش کی جاتی ہے تاکہ ہر شخص اپنے دل کے پورے اطمینان سے اسے تسلیم کرے۔ اس پر کسی قسم کی زبردستی نہ ہو۔ نہ جسمانی اکراہ، نہ ذہنی)۔

اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھئے۔ وہیں سے "مَنۡ یَّشَآءُ" کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا۔ زیرِ نظر آیت کا مطلب مفہوم سے واضح ہے۔

تقدیر کے عقیدہ سے انسان کو ایک جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ جب یہ عقیدہ راسخ ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ خدا جو کچھ کرتا ہے اس میں ہماری بہتری ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ چیز ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ ہمیں بہرحال راضی برضا رہنا چاہیئے۔ ان عقاید کی رُو سے انسان کو جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے لیکن قرآن اس قسم کے فریبِ نفس کو زائل کر کے بتاتا ہے کہ حقیقی اطمینان کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔

(۱۳/۲۸) اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَطۡمَٮِٕنُّ قُلُوۡبُهُمۡ بِذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَٮِٕنُّ الۡقُلُوۡبُ ﴿۲۸﴾

یہی وہ خدا کا قانون ہے جس سے ذہنی اور قلبی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اس قسم کے اطمینان کے بغیر ایمان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایمان انہی کا ہے جو اس طرح، بطیبِ خاطر، قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، حقیقت کو تسلیم کریں۔

پھر سُن لو کہ صحیح اطمینانِ قلب، خدا کے اس قانون کی رُو سے حاصل ہو سکتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (یعنی انسان کے اختیار و ارادے پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو اور وہ بطیبِ خاطر، اعترافِ حقیقت کرے)

"ذکر" کا مفہوم سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے. ملخص اس کا یہ ہے کہ پیش آمدہ معاملہ کے فیصلہ کے لیے قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو سامنے رکھنا اور ان کے مطابق عمل کرنا **ذکر اللہ** ہے. ذکر کے اس مفہوم کا عام کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ تصوّف نے اسے ایسے غلط معانی پہنا رکھے ہیں جو اسلام کی اصل و بنیاد کے خلاف ہیں۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی تائید خود قرآنِ کریم کی اگلی آیت سے ہو جاتی ہے. فرمایا:

۱۳/۲۹ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوۡبٰی لَہُمۡ وَ حُسۡنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

جو لوگ اس طرح ایمان لائیں اور اُس کے بعد خدا کے متعیّن کردہ پروگرام کے مطابق ایسے کام کریں جن سے، ان کی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور انسانیت کے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں، ان کے لیے ہر قسم کی خوشگواریاں ہیں اور نہایت حسین و متوازن مقامِ زیست ہے۔ (۳/۱۴)

طوبٰی کا مادہ (ط۔ ی۔ ب) ہے. اس کے معنی ہیں بہت زیادہ پسندیدگی۔ دائمی خوشحالی اور خوش بختی کی زندگی. دنیا اور آخرت کی بکثرت خوشگواریاں۔ ہمارے شاعروں نے اسے جو معنی پہنائے ہیں وہ شاعرانہ مضمون آفرینی سے زیادہ کچھ نہیں. طیّب کی طرح طُوبٰی بھی ایسا جامع لفظ ہے جس میں دنیا اور آخرت کی تمام خوشگواریاں سمٹ کر آ گئی ہیں. جن کے لیے خدا طوبٰی لھم کہہ دے انہیں اور کیا چاہیئے ؎

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اِس دُعا کے بعد

اس کے بعد کہا کہ جو کچھ اس قرآن میں کہا جا رہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے پہلے بھی رسول آتے رہے. اور خدا کی وحی لوگوں تک پہنچاتے رہے اور اُن لوگوں نے بھی اسی طرح پیغاماتِ خداوندی کی مخالفت کی جس طرح "اے رسول! تیری قوم اس کی مخالفت کر رہی ہے۔"

۱۳/۳۰ کَذٰلِکَ اَرۡسَلۡنٰکَ فِیۡۤ اُمَّۃٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہَاۤ اُمَمٌ لِّتَتۡلُوَا۠ عَلَیۡہِمُ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ ہُمۡ یَکۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ ؕ قُلۡ ہُوَ رَبِّیۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَ اِلَیۡہِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

اے رسول! ہم نے تجھے اس قوم کی طرف اسی طرح رسول بنا کر بھیجا ہے جس طرح ان سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف

رسول بھیجے تھے. مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں تو ان کے سامنے پیش کر دے[۵/۴۴]. ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ خدائے رحمٰن کو نہیں مانتے. تم، اُن سے کہہ دو کہ وہ میرا نشو و نما دینے والا ہے اور اس کے سوا کائنات میں کسی کا اختیار و اقتدار نہیں. میرا سارا بھروسہ اسی کے قوانین کی محکمیت اور نتیجہ خیزی پر ہے اور اسی لیے میں، ہر معاملہ میں، اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

پھر عنانِ توجہ معجزات کے موضوع کی طرف موڑ دی. فرمایا:

(۱۳/۳۱) وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْئَسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾

(ان لوگوں کی طرف سے جو محسوس معجزات کا مطالبہ ہوتا ہے (۱۲/۲) تو اس سے خود تمہاری جماعت کے بعض افراد کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے تو یہ سب ایمان لے آئیں اور یہ بہت اچھا ہو۔ ان سے کہہ دو کہ) اگر کوئی ایسا قرآن بھی ہوتا جس سے پہاڑ چلنے لگ جاتے اور زمین کی دور دراز مسافتیں آنکھ جھپکنے میں طے ہو جاتیں، حتیٰ کہ اس سے مردے بھی بولنے لگ جاتے (تو یہ لوگ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔ ۶/۷ ؛ ۶/۲۵ ؛ ۶/۱۱۲ ؛ ۱۵/۱۴-۱۵ ؛ ۱۷/۹۰-۹۳) یہی وجہ ہے کہ خدا نے تمام امور کو اپنے (قوانین کے) تابع رکھا ہے اور اس باب میں قانون یہ ہے کہ جو ہدایت حاصل کرنا چاہے وہ عقل و فکر سے کام لے ۱۰/۱۰۰)

کیا اب بھی تمہاری جماعت کے لوگ (مؤمنین) اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اگر لوگوں کو زبردستی مؤمن بنانا مقصود ہوتا تو خدا کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہ تھا (کہ وہ لوگوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا) کہ سب صحیح راستے پر چلتے۔ (لیکن اس نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس بات کو انسان کے اختیار و ارادہ پر چھوڑا ہے۔ لہٰذا) جو لوگ اس دعوت سے انکار کر رہے ہیں وہ سرکشی کی راہ اختیار کیے رہیں گے (اور اس کی مخالفت میں میدانِ جنگ تک میں اُتر آئیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) ان پر ان کی کرتوتوں کی وجہ سے آفتیں آتی رہیں گی اور یہ

سلسلہ یہاں تک بڑھے گا کہ جنگ کی مصیبت خود ان کے گھر (مکّہ) کے قریب نازل ہو جائے گی ۔ (یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا) تا آنکہ یہ کشمکش فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچ جائے گی (اور انہیں آخری شکست ہو جائے گی)۔ ایسا ہو کر رہے گا کیونکہ خدا کا قانون اپنی نتیجہ خیزی میں اٹل ہے۔ اس کے وعدے پورے ہو کر رہتے ہیں۔

یہ سوال کہ اگر دین کو زبردستی منوانا مقصودِ خداوندی ہوتا تو وہ انسان کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ سب انسان پیدائشی طور پر اسی دین پر ہوتے، متعدد مقامات میں آچکا ہے۔ مطالبُ الفرقان جلد اوّل صفحہ ۳۰۹-۳۱۲، اور جلد پنجم صـ۲۳ بالخصوص دیکھئے۔

اَفَلَمۡ یَایۡئَسِ میں یَایۡئَسِ کا مادہ (ی۔ ئ۔ س) ہے جس کے عمومی معنی یاس اور نااُمیدی کے ہیں لیکن لُغت میں اس کے معنی اَفَلَمۡ یَعۡلَمۡ بھی دیئے گئے ہیں۔ یعنی "کیا انہوں نے اس بات کو جان نہیں لیا؟" زیرِ نظر آیت میں یہی معنی موزوں اور مفہوم کے مطابق ہیں۔ (دیکھئے لُغات القرآن۔ مادہ (ی۔ ئ۔ س) صـ۱۷۸۲)۔
اس کشمکش کا آخری مرحلہ کیا ہوگا، فرمایا۔

۱۳/۳۲ وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَاَمۡلَيۡتُ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ فَكَيۡفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

(یہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہوگا۔ اور اس دوران میں، یہ لوگ تمہاری باتوں کا مذاق اڑاتے رہیں گے۔ لیکن تم اس سے دل برداشتہ نہ ہونا) اس قسم کا استہزاء تم سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ہوتا رہا ہے۔ ان لوگوں کو بھی ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق مُہلت کا وقفہ ملتا رہا۔ لیکن جب وہ، اس پر بھی اپنی غلط روش سے باز نہ آئے تو ان کی گرفت ہوئی۔ (اُس وقت انہیں معلوم ہوا کہ) اُن کے اعمال کے نتائج کس طرح ان کا پیچھا کر رہے تھے اور ہماری عقوبت کیسی سخت ہوتی ہے۔

خُدا کے رسولوں اور اس کی آیات سے استہزاء بھی متعدد مقامات میں آیا ہے۔ (انڈکس دیکھئے) یہ دنایت کی آخری حد ہوتی ہے۔



قرآن کی بنیادی تعلیم "اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ" ہے۔ یعنی تمام قوتوں کا مالک ایک خُدا۔ ذہنِ خداوندی اپنے عہدِ طفولیت میں اسے بھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ یہ عظیم تصوّر اس کے ذہن میں سما نہیں سکتا تھا۔ اس لیے اس نے مختلف

قوتوں کے لیے مختلف إِلٰه (خدا) وضع کر رکھے تھے۔ اسے شرک کہا جاتا ہے۔ قرآن نے کس کس انداز سے اور کیسے کیسے پیرایہ میں اس کی تردید کی ہے، اس کے لیے انڈکس میں شرک کا عنوان دیکھئے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے۔

۱۳/۳۳ أَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوهُمْ ۚ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

(ان سے کہو کہ ذرا اس پر غور کرو کہ) جس خدا کے قانونِ مکافات کی ہمہ گیری اور خبر رسی کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر فرد کے اعمال پر اس طرح نگاہ رکھتا ہے، کیا وہ (اپنی مدد کے لیے ان کا محتاج ہو سکتا ہے) جنہیں یہ لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں؟ ان سے کہو کہ (خدا کے علم کی وسعتوں کے متعلق تو تمہیں بتا دیا گیا ہے۔ اب تم جن ہستیوں کو اس کا شریک قرار دیتے ہو ذرا) ان کے علم کی تفصیلات بھی بیان کرو تا کہ پتہ چلے کہ روئے زمین پر کون سی بات ایسی ہے جو خدا کے احاطۂ علم سے باہر رہ گئی ہے اور اس کی خبر تم ان شرکاء کے ذریعے خدا کو دینا چاہتے ہو۔ اُن شرکاء کے ذریعے جو کچھ بھی نہیں جانتے۔

یا کیا یہ بات ہے کہ تم نے ان امور کی گہرائیوں میں اتر کر کبھی غور نہیں کیا۔ محض سطحی طور پر (جو سنتے آئے وہی دُہرا دیا)۔

(حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس، ان کے دعویٰ کی صداقت کی دلیل کوئی نہیں۔ یہ محض جذبات سے کام لیتے ہیں جن کی وجہ سے) انہیں اپنی تدابیر بڑی خوش آیند دکھائی دیتی ہیں اور اسی سے یہ صحیح راستے کی طرف آنے سے رُک گئے ہیں۔

خدا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں اور اپنے جذبات کی رَو میں بہہ جائیں، وہ کبھی صحیح راستے کی طرف نہیں آ سکتے۔ سو جو لوگ اس طرح غلط راستہ اختیار کر لیں، انہیں کون صحیح راستہ دکھا سکتا ہے۔

اس میں شرک کے ایک گوشے کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ لوگ اس لیے معبود تراشتے ہیں تاکہ وہ ان کی بات خدا تک پہنچا دیں (۳۵/۳۹)۔ ہم (مسلمان) جب اس قسم کی آیات پڑھتے ہیں تو ہماری نگاہیں مشرکین کے عقاید، ان کے دیوی دیوتاؤں، ان کی عبادت گاہوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ ہم کبھی اپنے گھر کی طرف جھانک کر نہیں دیکھتے۔ ہم

کس طرح "حضرت صاحبان" کی بارگاہوں میں حاضر ہوکر گڑگڑا گڑگڑا کر عرض کرتے ہیں کہ یا حضرت! ہمارے لیے خدا سے دعا کیجئے۔ عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نہ ہمارے احوال سے واقف ہے نہ ہماری بات براہِ راست سُنتا ہے۔ یہ بزرگ خدا کے مقرب ہیں۔ یہ ہماری بات خدا تک پہنچا سکتے ہیں۔ کیا یہ وہی شرک نہیں جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے؟ چونکہ ہم اس موضوع پر شرک اور دعا کے عنوانات کے تحت بہت کچھ لکھ چکے ہیں (اور میری کتاب۔ تصوف کی حقیقت ــــ اس موضوع پر مستقل تصنیف ہے)، اس لیے یہاں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ــــ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوگا؟ فرمایا:

۱۳/۳۴ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

ان کی غلط روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان پر اس دنیا کی زندگی میں بھی تباہی آئے گی اور آخرت کی تباہی اس سے بھی زیادہ جگر پاش ہوگی۔ انہیں خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

قرآن کریم اس حقیقت کو بار بار دُہراتا ہے کہ غلط روشِ زندگی کا تباہ کن عذاب اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے (اور اس طرح صحیح طرزِ زندگی کی خوشگواریاں بھی) بالفاظِ دیگر جنت اور جہنم کا آغاز یہیں سے ہو جاتا ہے اور مسلسل اُخروی زندگی تک چلتا ہے۔ انڈکس میں جنت اور جہنم کے عنوانات دیکھئے۔ اس اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آجائے گی۔ زیرِ نظر آیت میں دنیا اور آخرت دونوں کے عذاب کا ذکر آگیا ہے۔

یہ تو تھا جہنم۔ اس کے برعکس جنت:

۱۳/۳۵ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

(ان کے برعکس، صحیح راستے پر چلنے والوں کے لیے جنت کی زندگی ہوگی)، اس جنت کی مثال یوں سمجھو کہ، ایک باغ ہے جس میں پانی کی ندیاں جاری ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ اس کے پھل وقتی نہیں دائمی ہیں اور اس کی آسائش پائدار (۱۳/۲۵ ؛ ۴۷/۱۵)۔ اس قسم کا مآلِ زندگی ہوگا ان لوگوں کا جو غلط روش سے بچ کر قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں۔ ان کے برعکس، جو لوگ ان قوانین سے انکار کریں گے ان کا انجام تباہی اور بربادی ہوگا۔

بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) کو تمثیلی انداز ہی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اُخروی زندگی کی ہر حقیقت ماوراء الطّبیعات ہے اس لیے قرآنِ کریم نے اسے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ ان حقائق کو مادی اور محسوس نہیں سمجھنا چاہیئے۔ تمثیلات سے ان کا ایک تصوّر ذہن میں آ سکتا ہے۔ وہ درحقیقت ہیں کیا، اسے ہم اپنے تصوّر کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔

جیسا کہ متعدد مقامات پر بیان کیا جا چکا ہے، قرآنِ کریم قوموں کی اس دنیا کی زندگی کو بھی جنّت اور جہنّم سے تعبیر کرتا ہے۔ ان کا بیان بھی درحقیقت تمثیلی اور تشبیہی ہی ہے۔ (مثلاً) وہ "دودھ کی نہریں اور شہد کی ندیاں" کہتا ہے تو اس سے مراد سچ مچ کی ندیاں اور نہریں نہیں ہوتیں بلکہ اس کا مطلب بکثرت اور با افراط ہوتا ہے۔ ہم بھی اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ "وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں"۔ سو جنّت اور جہنّم اُخروی زندگی کے ہوں یا اس دُنیا کے، ان کے بیانات کو تمثیلی سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ تمثیلات و تشبیہات وہی ہو سکتی تھیں جو زمانۂ نزولِ قرآن کی مخاطب قوم (عربوں) کی سمجھ میں آ جائیں۔ وہ ایران اور روم کی تہذیب و تمدّن اور وہاں کی معاشرتی آسائشوں اور آرائشوں کو (IDEAL) سمجھتے تھے۔ اس لیے قرآن میں مثالیں بھی بیشتر انہی کے معاشرہ کی دی گئی ہیں۔ اس موضوع پر اس سے پیشتر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اس لیے یہاں ان اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (دیکھئے مطالبُ الفرقان۔ جلد اوّل ص۱۴۵؛ ص۱۹۵؛ ص۳۳۴۔ وہاں زیرِ نظر آیت بھی آ گئی ہے۔)

جنّت کی زندگی قرآنِ کریم کے اتباع سے ملتی ہے۔ سورۂ یونس کی آیت ۱۰/۵۸) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ وہ ایسی نعمتِ بے بہا کے ملنے پر جشنِ مسرّت منائیں یہاں اسی کا اعادہ کیا گیا جو فرمایا کہ:

(۱۳/۳۶) وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

جن لوگوں کو ہم نے اس قسم کا ضابطۂ ہدایت دیا ہے (جس پر عمل پیرا ہونے کے نتائج ایسے خوشگوار ہیں) وہ ہر اس بات پر جو تیری طرف نازل کی جاتی ہے، جشنِ مسرّت مناتے ہیں۔ باقی رہیں دوسری جماعتیں، سو ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن پر بعض احکام بہت ناگوار گزرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ (تمہیں خوش لگے یا ناگوار گزرے) مجھے تو صرف اسی کا حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف اللہ کی اطاعت اور محکومیت اختیار کروں اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کروں

اسی مسلک کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف خود بھی رجوع کرتا ہوں۔

یہاں جو کہا گیا کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کتاب کے بعض حصے پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض حصے سے انکار کرتے ہیں یا وہ احکام انہیں ناگوار گزرتے ہیں تو اس کی تفصیل سورۃ بقرہ۔ آیت (۸۵/۲) میں گزر چکی ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ اس روش کا نتیجہ دنیا میں ذلت اور خواری کی زندگی اور آخرت میں شدید عذاب ہوگا۔ اسلام یہ ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کی مکمل اطاعت کی جائے اور اس میں کسی اور اتھارٹی کو شریک نہ کیا جائے۔ قرآن اسی مقصد کیلیے نازل کیا گیا ہے۔

۱۳/۳۷ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

اور اسی مقصد کے لیے ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو نہایت واضح طور پر نازل کیا ہے۔ اے مخاطب! اگر تو اس علم و حقیقت کے پا لینے کے بعد بھی، ان راہ گم کردہ لوگوں کے خیالات کا اتباع کرے تو یہ سمجھ لے کہ قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں نہ تو تیرا کوئی دوست اور کارساز ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی گرفت سے تجھے کوئی بچا سکتا ہے۔

اس کے بعد مخاطبین کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا کہ یہ رسول، عام انسانوں جیسا انسان کیوں ہے؟ فرمایا کہ یہ بات اس رسول کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ تمہارے (اہلِ کتاب) کے ہاں بھی تو رسول آتے رہے ہیں۔ وہ بھی عام انسانوں جیسے انسان ہی ہوتے تھے (دیکھئے۔ انڈکس میں عنوان رسولؐ) خدا کے ہاں فیصلے قانون کی رُو سے ہوتے ہیں۔ رسولوں کی بشریت یا فوق البشریت کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۳/۳۸ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

(باقی رہا ان کا یہ اعتراض کہ انہی جیسا ایک انسان کس طرح رسول بنا دیا گیا تو اُن سے کہہ دو کہ) ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے تھے (وہ بھی تمہاری طرح انسان ہی تھے اور) ان کے بیوی بچے بھی تھے۔

اس کے بعد ان کے اس تقاضا کی طرف آؤ کہ جس تباہی کا تم بار بار ذکر کرتے ہو، وہ آتی کیوں نہیں۔ تو ان سے کہہ دو کہ) یہ بات کسی رسول کے اختیار میں نہیں ہوتی کہ وہ اس قسم کی کھلی نشانی کو جب جی چاہے اپنی مرضی کے

مطابق لے آئے۔ یہ چیزیں اللہ کے قانون کے مطابق، اپنے وقت پر ظہور میں آتی ہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ ہر عمل اور اس کے نتیجے کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفہ کو میعاد یا اجل کہتے ہیں۔ یہ اجل ایک قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

یعنی اس بات کے لیے قانون مقرر ہے کہ ایک عمل اپنے نتیجہ خیز ہونے میں کتنا وقت لیتا ہے۔ اس طرح قوموں کی بھی اجل ہے (۴۹/۱۰)

اس میں اہم نکتہ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ہے۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد پنجم (ص۱۸۹) میں آچکی ہے۔ نیز جلد چہارم ص۲۵۳۔ اس سلسلہ میں عنوان — قوم یا اقوام بھی دیکھئے، جہاں قوموں کے عروج وزوال اور استبدال و استخلاف سے متعلق قوانین کا ذکر آیا ہے۔ اس کو "قانونِ محو و ثبات" بھی کہا جاتا ہے۔

۱۳/۳۹ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

جو قوم، نظریۂ زندگی، یا نظامِ حیات اس قابل نہیں ہوتا کہ باقی رہے، وہ خدا کے قانون کے مطابق مٹا دیا جاتا ہے اور جو اپنے آپ کو، قانونِ خداوندی کے مطابق محکم اور استوار ثابت کر دیتا ہے اسے باقی رکھا جاتا ہے (۱۳/۱۷؛ ۸/۴۲)

یہ سب کچھ اُن اصولی قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو تخلیقِ کائنات کے ساتھ، اللہ نے مقرر کر رکھے ہیں اور جن کے مطابق اس کا نظم و نسق چل رہا ہے۔

قانونِ محو و ثبات ایک عظیم حقیقت ہے۔ سلسلۂ ارتقاء اس قانون کے مطابق جاری و ساری رہا ہے (اور ہے)۔ جس نوع میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہ رہی، وہ مٹ گئی۔ جس میں اس کی صلاحیت تھی، وہ باقی رہی۔ قوموں کی موت و حیات کا فیصلہ بھی اسی قانون کی رُو سے ہوتا ہے۔

سورۃ شوریٰ کی آیت (۴۲/۲۴) میں کہا گیا ہے کہ باطل محو ہو جاتا ہے اور حق کو ثبات حاصل ہوتا ہے اور یہ سب کچھ خدا کے قوانین (بِكَلِمٰتِهٖ) کے مطابق ہوتا ہے۔ آپ دیکھئے، ہر مقام پر اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ سب کچھ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ یونہی اتفاقیہ یا دھاندلی سے نہیں ہوتا۔

یہ کہ یہ قانون غیر متبدّل ہے اور کسی کی خاطر اس میں رعایت نہیں ہوتی۔ اس کی وضاحت خود حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کی رُو سے کر دی جہاں کہا:

۱۳/۴۰ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا

عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝۴۰

جن باتوں کا اُن سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ تو بہرحال ہوکر رہیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض باتیں تیرے سامنے وقوع پذیر ہوجائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تو اس سے پہلے ہی وفات پاجائے (لہٰذا، اس کا خیال نہیں کرنا چاہئیے کہ یہ نتائج کب برآمد ہوتے ہیں) تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطۂ ہدایت کو لوگوں تک پہنچاتے جائے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ ہمارے قانون کے مطابق نتائج کب ظہور میں آتے ہیں۔

یہ مضمون سورۃ یونسؔ کی آیت (۱۰/۴۶) میں بھی آچکا ہے۔ تفصیل وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

قانون کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ہی رسول اللہ پر یہ واضح کردیا کہ اس انقلاب کا آغاز ہوچکا ہے۔

۱۳/۴۱ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝۴۱

(یہ جو ہر وقت تقاضا کرتے رہتے ہیں کہ وہ نظامِ ربوبیت کب قائم ہوگا جس میں ان کی انفرادی مفاد پرستیاں ختم ہوجائیں گی تو) کیا انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہم کس طرح زمین (وسائلِ پیداوار) کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر ان کے مقبوضات کو کم کرتے چلے جاتے ہیں (۲۱/۴۴) اسی طرح ایک دن ایسا آجائے گا جب ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہے گا۔ سب کچھ نوعِ انسان کے لیے عام ہوجائے گا (۴۱/۱۰) یہ خدا کا فیصلہ ہے۔ اور جو فیصلہ خدا کرتا ہے، دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جو ان فیصلوں کو ٹال سکے۔ وہ محاسبہ کرنے میں بڑا تیز ہے۔

مطالب الفرقان، جلد اوّل (صہ۲۹۶) پر بتایا جاچکا ہے کہ قرآن کریم کے معاشی نظام کی رُو سے زمین پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں رہ سکتی۔ یہ مملکت کی تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے عام افرادِ معاشرہ کی پرورش کا انتظام کرسکے۔ اس انقلاب کے آغاز کے متعلق جلد اوّل صہ۳۰ میں بھی ذکر آچکا ہے۔ جب یہ انقلاب اپنی تکمیل تک پہنچ جائے گا تو تمام ذرائع رزق ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عام ہوجائیں گے۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہے گی۔

زیرِ نظر آیت میں اَرض کے معنی "زمین" لیے گئے ہیں اور قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے یہ معانی بھی درست ہیں۔ لیکن آیت (۲۱/۴۴) میں انہی الفاظ کے بعد کہا ہے۔ أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ ۔ کیا ان کا غلبہ باقی رہ جائے گا؟ یہاں اس غلبہ کا ذکر ہے جو زمینداری اور جاگیرداری کی رُو سے حاصل ہوتا ہے اس لیے ان آیات میں غلبہ کا مفہوم بھی درست ہے۔ زمین کی ملکیت کا کم اور ختم ہونا اور غلبہ کا باقی نہ رہنا لازم و ملزوم ہیں۔ قرآنی انقلاب میں، نہ کوئی کسی کا محتاج ہوگا نہ

محکوم. اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست — عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس انقلاب کو کوئی روک نہیں سکتا۔

(۱۳/۴۲) وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٤٢﴾

ان سے پہلے بھی (مفاد پرست گروہوں نے) بڑی بڑی تدبیریں کر دیکھیں (کہ خدا کے فیصلے نافذ نہ ہونے پائیں لیکن کسی کی کچھ پیش نہ گئی) ان کی تدبیریں خدا کے قوانین کے مطابق ہی نتیجہ پیدا کرتی رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص جو کچھ بھی کرے، خدا کو اس کا علم اچھی طرح ہوتا ہے۔ لہٰذا قوانینِ خداوندی سے انکار کرنیوالوں کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ آخرالامر بازی کس کے ہاتھ میں رہتی ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے؟

باقی دنیا کو چھوڑئیے۔ اس کے خلاف سب سے بڑی سازشیں تو خود ہم (مسلمانوں) نے کیں جو نظامِ ملوکیت کو لے آئے۔ اس کے ساتھ نظامِ پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری خود بخود آگئے۔ آج بھی دنیا نظامِ سرمایہ داری سے تنگ آکر ایسے نظام کی تلاش میں ہے جس میں نہ کوئی شخص روٹی کے لیے کسی کا دستِ نگر ہو فلہٰذا نہ کسی کا محکوم اور دبیل لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت آج بھی نظامِ سرمایہ داری کو اسلام کا تقاضا قرار دے رہی ہے مگر قرآنی نظام کی مخالفت کرنیوالے دیکھ لیں گے کہ انجام کار کامیابی کسے حاصل ہوتی ہے؟

قرآن سے انکار کرنے کے معنی رسول کی رسالت سے انکار کرنا ہوتا ہے۔

(۱۳/۴۳) وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾

یہ لوگ جو قانونِ خداوندی سے انکار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ تو خدا کا پیغامبر نہیں (اس لیے کہ تو اس تباہی کو جلدی نہیں لاتا جس کی دھمکیاں دیتا ہے)، ان سے کہہ دو کہ (میں اس بات پر تم سے قطعاً جھگڑا نہیں کرنا چاہتا)، تمہارے اور میرے درمیان جو فیصلہ قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوگا وہ میری صداقت کی کافی شہادت ہوگا یا اس شخص کی شہادت جو قانونِ خداوندی سے واقف ہو (اور اس لیے سمجھ سکتا ہو کہ جو کچھ میں پیش کرتا ہوں وہ خدا کا قانون ہے یا میرا خود ساختہ!)

آپ کو شاید علم نہ ہو کہ ہمارے علماء کے ہاں "علم الکتاب" ہوتا ہی نہیں۔ انہیں اٹھارہ اٹھارہ علوم پڑھائے جاتے ہیں لیکن قرآن ان کے نصاب میں نہیں ہوتا۔ آخری سال تبرکاً سورۃ بقرہ کی تفسیر پڑھا دی جاتی ہے اور بس۔ قرآنی انقلاب تو وہی لاسکے گا جس کے پاس علم الکتاب ہوگا!

سورۃ الرعد ختم شد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تیرہواں پارہ ———— چودہویں سُورۃ



باب سوم

سُوْرَۃُ اِبْرٰھِیْم

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ

(انقلابِ قرآنی)

- نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جانے والی کتابِ ہدایت۔
- اَیَّامِ اللہِ۔ قومِ موسیٰؑ کی مثال۔
- انبیائے سابقہ اور اقوامِ گزشتہ کے احوال وکوائف کی یاد دہانی۔
- نبوّت انسان کا اِکتسابی ملکہ نہیں، یہ موہبتِ خداوندی ہے۔
- جہنّمی زندگی۔ لیڈروں اور متّبعین کے مکالمات۔
- جنّتی زندگی۔ شادمانیاں اور کامرانیاں۔
- خوشگوار نظریۂ حیات اور غلط نظریۂ زندگی، اور اُن کے حاملین کا تقابل۔
- قانونِ مکافاتِ عمل اور کائنات میں جاری وساری نظامِ ربوبیّت۔
- عالمگیر نظامِ ربوبیّت کی بنیاد کے لیے حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں تعمیرِ کعبہ۔
- اس نظام کے قیام کے لیے ابراہیمؑ کی حسین آرزوئیں۔
- تاریخی کوائف وحوادث کا تذکرہ موعظت وعبرت۔
- باطل معاشرہ میں اصلاحِ احوال ممکن نہیں۔ اس کی جگہ نیا معاشرہ قائم کرنا ضروری ہے۔

باب سوم

سُورَۃُ اِبرَاھِیم

چودھویں سُورۃ

۱۴/۱ الٓرٰ قف کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ ①

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ ضابطۂ قوانین ہم نے تیری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تو، اس کے ذریعے نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے (۵/۱۴ ; ۲۰/۲۰) اور ان کے نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق، انہیں اس خدا کے تجویز کردہ راستے پر ڈال دے جو جلال و جمال اور حسن و قوت کا مالک ہے۔ (۱۴/۶)

قرآنِ کریم کا مقصد یہ بتایا کہ یہ نوعِ انسان کو ظلمات سے نور کی طرف لے جائے گا۔ اُس راستے سے جو خود خدا کا تجویز فرمودہ ہے "ظلمات اور نور" قرآنِ مجید کی بڑی اہم اور معروف اصلاح ہے جسے اس نے اکثر استعمال کیا ہے۔ اس کا مفہوم ـــ مطالب الفرقان۔ جلد اوّل صفحہ ۲۶۱ پر دیکھئے۔ ہر وہ عقیدہ، نظریہ، مسلک جو الحق (قرآن) کے خلاف ہو ظلمات کے تحت آجاتا ہے اور النور خود قرآنِ مجید ہے۔ لیکن یہاں چند قدم آگے چل کر، قرآن نے ظلمات اور نور کی کشمکش کے ایک خاص گوشے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ پانچویں آیت میں ہے کہ صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰ کو اس مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ قوم بنی اسرائیل کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے آئے۔ بنی اسرائیل شخصی حکومت (فرعون) کے استبداد، مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے "مقدس دام" اور سرمایہ داری (قارون) کی ہوسِ خون آشامی کی تاریکیوں میں بُری طرح گھرے ہوئے تھے۔ انہیں ان محکومیوں اور غلامیوں کے پنجے سے چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط میں لے جانا، تاکہ وہ صرف اپنے خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کر سکیں، ظلمت سے نور کی طرف لے جانا تھا۔ اس کشمکش میں خدا اور ملائکہ کی مدد کس طرح مومنین کے شاملِ حال ہوتی ہے، اسے (۴۳/۳۳) کے ان الفاظ میں واضح کر دیا جنھیں عرفِ عام میں درود کہا جاتا ہے

اور جس کا مفہوم مطالب الفرقان، جلد سوم ص۳۱۱ میں دیا گیا ہے) یہاں اس نکتہ کی وضاحت پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ اخراج من الظلمت الی النور کا مرحلہ قرآن کریم میں دیئے گئے پروگرام کی رُو سے طے ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم حامل قرآن ہونے کے دعوے کے باوجود ظُلُمٰت (ذلّت، پستی، محکومی، غلامی، مفلسی، ناداری، کمزوری، بداخلاقی وغیرہ) سے نکل نہیں سکتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ اس کتاب عظیم کو تو گلے میں لٹکائے یا طاقوں میں سجائے رکھتی ہے، عمل اس کا اس کے خلاف ہے کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک قوم قرآن پر عمل پیرا ہو اور پھر "ظُلمات کی ظلمات" میں رہے۔

اِذنِ اللہ کے معنی قانونِ خداوندی ہیں۔ (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد سوم ص۴۲۵)۔ یہاں اس خدا کا راستہ (صراط) کہا گیا ہے جو عزیز بھی ہے اور حمید بھی۔ وہ جس کے قوانین کا غلبہ اور قوت حمد آفریں نتائج پیدا کرتے ہیں (انڈکس میں عنوان حمد دیکھئے) اس کا مظہر نگارخانۂ کائنات ہے۔

۱۴/۲ اَللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ﴿۲﴾

وہ خدا، کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اُس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے۔ جو لوگ اس کی تجویز کردہ راہ پر چلنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے لیے سخت تباہی و بربادی ہے۔ غلط راستے پر چلنے کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

یہ کون لوگ ہیں؟

۱۴/۳ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۳﴾

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اس طبعی (حیوانی) زندگی اور سطح انسانیت کی (اُخروی) زندگی کے مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو یہ طبعی زندگی کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں اور لوگوں کو صحیح راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں (کیونکہ اس سے ان کے مفاد پر زد پڑتی ہے) اور کوشش کرتے ہیں کہ اس سیدھی راہ میں (اپنے خود ساختہ مذہب و شریعت کی آڑ میں) کجی پیدا کر دیں اور اس طرح دین کو کچھ سے کچھ بنا دیں۔

یہ ہیں وہ لوگ جو ایک بہت بڑی گمراہی کا شکار ہو رہے ہیں۔

مذہبی پیشوائیت کی ان دسیسہ کاریوں (یعنی خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانے اور سیدھے سادے دین میں

الجھنیں پیدا کر دینے) کا ذکر متعدد مقامات میں آیا ہے۔ اس کا تفصیلی مفہوم مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۶۷۹۔ زیر آیت (۳/۹۸) دیکھئے۔ یہاں اس "کارستانی" کو مذہبی پیشوائیت تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان لوگوں کو بھی اس کے اندر شامل کر لیا ہے جو دنیاوی مفاد کو اقدارِ خداوندی پر ترجیح دیتے ہیں اور اول الذکر میں زیادہ کشش اور جاذبیت محسوس کرتے ہیں۔ یہ لوگ قرآنی راستے سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔

بات شروع سے قرآن کے متعلق ہو رہی تھی۔ خود قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اسے عربی مبین میں نازل کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے دیکھئے مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۳۲۰۔ قرآنِ کریم کے عربی میں نازل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ صرف عربوں کے لیے تھا (اور انہی کے لیے ہے) قرآن کا تو خود دعویٰ ہے کہ یہ تمام نوعِ انسان کے لیے قیامت تک ضابطۂ حیات ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ (اس کے باوجود) یہ صرف کسی ایک زبان ہی میں نازل ہو سکتا تھا۔ اور وہ وہی زبان ہونی چاہیئے تھی جو رسولؐ اللہ کی اولین مخاطب قوم کی تھی اور وہ عربی تھی۔ باقی دنیا کو (اسے سمجھنے کے لیے) اس کی زبان سیکھنی ہو گی۔ علم حاصل کرنے کا طریق ہی یہ ہے۔ بالخصوص اس کتاب کا علم جس کا (کسی زبان میں بھی) ترجمہ اس کی اصل کا صحیح مفہوم ادا نہیں کر سکتا۔ (دیکھئے مذکورہ بالا حوالہ) اس قرآن سے ہدایت (صحیح راستے کی طرف رہنمائی) حاصل ہو گی اور اسے چھوڑ دینے سے افراد اور اقوام گمراہ ہو جائیں گے

(۱۴/۴) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

اور ہم نے جتنے رسولؐ بھی بھیجے ہیں وہ اپنی قوم کی زبان میں پیغامِ حق پہنچاتے تھے تاکہ وہ اس طرح لوگوں پر قوانینِ خداوندی کو بالکل واضح کر دیں۔ (اس کے بعد لوگوں کو اختیار دیا گیا کہ) جو چاہے قانونِ خداوندی کے مطابق سیدھی راہ اختیار کرے اور جو چاہے غلط راستے پر چلتا رہے۔ اللہ کا قانون غلبہ اور حکمت پر مبنی ہے۔

اس کے بعد قوم موسےٰؑ کے اخراج مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ کا ذکر آیا ہے۔

(۱۴/۵) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ⑤

اسی نہج کے مطابق ہم نے موسیٰؑ کو، اپنے ضابطۂ قوانین کے ساتھ بھیجا کہ وہ بنی اسرائیل کو موت کی تاریکیوں سے نکال کر زندگی کی روشنی میں لے آئے اور انہیں ان تاریخی سرگزشتوں کی یاد دلائے جن میں نظامِ خداوندی کو غلبہ اور تسلّط حاصل ہُوا تھا۔ ان سرگزشتوں میں ان لوگوں کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں جو مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی کوششیں بھرپُور نتائج کی حامل ہوں۔

داستانِ بنی اسرائیل گزشتہ جلدوں میں متعدد مقامات پر شرح و بسط سے آچکی ہے (انڈکس دیکھئے) اس لیے زیرِنظر آیات کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان کے مفہوم پر اکتفا کیا جائے گا، بجز کسی خاص یا جدید نکتہ کے۔

غور فرمائیے۔ یہاں تذکرہ دو قوموں کی کشمکش اور تصادم کا ہے اور اسے ایّام اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ دو قوموں کی کشمکش نہیں، درحقیقت حق و باطل کی کشمکش ہے اور اسی نہج سے اسے ایّام اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلام کی تاریخ اور باقی دنیا کی تاریخ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اسلام کی تاریخ حق و باطل کی کشمکش کی تاریخ ہوگی اس لیے اسے ایّام اللہ کہا جائے گا۔ باقی دنیا کی تاریخ ہی نہیں، بلکہ خود مسلمانوں کی (ایک قوم کی حیثیت سے) تاریخ بھی ایّام اللہ نہیں کہلائے گی۔ وہ بھی، دیگر اقوامِ عالم کی تاریخ کی طرح ایک قوم کی تاریخ ہوگی۔ اسلام کے صدرِ اوّل کے بعد حق و باطل کی کشمکش کا دور ختم ہوگیا تھا اس لیے اس کے بعد ایّام اللہ کا دور بھی باقی نہ رہا۔ اس کے بعد ہماری تاریخ، اسلام کی تاریخ نہیں، مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اس فرق کو پیشِ نظر نہ رکھنے سے بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ واقعات سلاطین کے عہد کے ہوتے ہیں (خواہ وہ کسی ملک میں ہوں) اور انہیں اسلامی تاریخ کی حیثیت سے مزعومہ اسلام کی تائید میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، صدرِ اوّل کے بعد ہماری ساری تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ ایّام اللہ تو اس کے بعد وجہِ فروغِ دیدہ ہوئے ہی نہیں۔ دنیا میں جس قدر کتابیں "اسلام کی تاریخ" کے نام سے متداول ہیں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اسلام کی تاریخ آج تک مرتب ہی نہیں ہوئی۔ یہ جب بھی مرتب ہوگی، اس کا انداز یہ ہوگا کہ اسلام عہل (دورِ ابتداء) میں کیا تھا۔ اب اس کی شکل کیا ہو چکی ہے اور یہ تبدیل کیسے ہوئی — یہ ہوگی اسلام کی تاریخ۔ میں نے اپنی کتاب — شاہکارِ رسالتؐ — کے آخری باب میں اس کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس کی تفصیلی تاریخ لکھنے کی خواہش ایک عرصے سے دل میں مچل رہی ہے لیکن (دیگر زیادہ اہم مصروفیات کی وجہ سے) اس کے لیے ابھی تک وقت نہیں مل سکا۔ (بیدہ التوفیق)

ایّام اللہ اور عام تاریخ میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہوگا کہ عام تاریخ تو محض واقعات کا مجموعہ ہے یا زیادہ سے زیادہ ان واقعات کے طبیعی اور سیاسی اسباب کا تذکرہ۔ لیکن ایّام اللہ (کی تاریخ) میں ہر صبّار اور شکور، قوم کے لیے

سفرِ حیات کامیابی سے طے کرنے کے لیے عظیم نشاناتِ راہ ہوں گے (انڈکس میں تاریخ کا عنوان دیکھئے)

اس داستان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

۱۴/۶ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنجَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٦﴾

جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ان عنایاتِ خداوندی کو یاد رکھو کہ اس نے تمہیں کس طرح، فرعون کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی۔ وہ لوگ تم پر ڈھونڈ ڈھونڈ کر، سخت عذاب لاتے تھے۔ ان میں بدترین عذاب یہ تھا کہ وہ تمہاری قوم کے معزز افراد کو ذلیل کیا کرتے تھے اور جو جوہرِ مردانگی سے عاری ہوتے تھے انہیں معزز و مقرب بنایا کرتے تھے (۲/۴۹)۔ تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا کر تمہاری قومی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی پیدا کر دی اور یہ اس کی طرف سے بہت بڑی نعمت تھی۔

یہ تمام واقعات پہلے آ چکے ہیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا:

۱۴/۷ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ﴿٧﴾

اور تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہیں صاف صاف بتا دیا کہ اس عظیم انقلاب سے مقصد یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ امکانات پیدا کر دیئے جائیں کہ تم اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کر سکو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا اور ان صلاحیتوں کو ہمارے پروگرام کے مطابق صحیح مصرف میں لائے تو جو کچھ تمہیں حاصل ہوا ہے اس میں اور اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور جو کچھ ملا ہے اس کی قدر نہ کی تو اس کا نتیجہ سخت تباہی اور بربادی ہوگا۔

اور اس کے ساتھ اس امر کی بھی تشریح کر دی کہ:

۱۴/۸ وَقَالَ مُوسَىٰ إِن تَكْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۙ فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٨﴾

چنانچہ موسیٰ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے، ان سے کہہ دیا کہ اگر تم نے خدا کی اس بخشائش کی قدر نہ کی — اور تم ہی نہیں، اگر ساری دنیا کے انسان بھی اسی طرح ناسپاس گزاری کی راہ اختیار کرلیں تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ انسانوں کی اپنی ہی تباہی ہوگی۔ وہ تمہاری سپاس گزاری کا محتاج نہیں۔ پورا نظام کائنات اس کے سزاوار حمد و ستائش ہونے کی زندہ شہادت ہے (لہٰذا وہ تم سے جن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے)۔

اور پھر قرآن کے عام انداز کے مطابق، انبیاء سابقہ اور اقوام گزشتہ کے احوال و کوائف کی یاد دہانی کرائی۔

۱۴/۹ اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۬ۛ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فِیْۤ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ۝۹

(موسیٰ نے ان سے یہ بھی کہا کہ) کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ ان قوموں پر کیا بیتی تھی جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں — قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور کئی قومیں جو ان کے بعد آئیں اور جن کے حالات کسی تاریخ میں محفوظ نہیں۔ صرف اللہ کو معلوم ہیں۔ ان کی طرف، ان کے پیغامبر واضح قوانین لے کر آئے۔ لیکن، ان لوگوں نے ان کی سخت مخالفت کی اور ہر ممکن کوشش کی کہ ان کی آواز کو بلند نہ ہونے دیا جائے۔ ان کی بات آگے نہ بڑھنے پائے۔ انہوں نے ان رسولوں سے اعلانیہ کہہ دیا کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو، ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں اور جس نظام کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو، ہمیں اس کی صداقت اور کامیابی پر قطعاً یقین نہیں۔ ہمارے دلوں میں اس کے متعلق بڑے شکوک و اضطرابات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے جواب میں:

۱۴/۱۰ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَدْعُوْكُمْ لِیَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾

ان رسولوں نے اُن سے کہا کہ کیا تمہیں اُس خدا کے بارے میں شک ہو رہا ہے جس نے اس کائنات پست و بلند کو پیدا کیا ہے؟ — جو نظام اُس خدا کا تجویز فرمودہ ہو، کیا تمہیں اس کی صداقت اور کامیابی کے متعلق شک ہے؟ وہ تمہیں اس نظام کی طرف صرف اس لیے دعوت دیتا ہے کہ تمہارے لیے اس تباہی سے محفوظ رہنے کا سامان پیدا کر دے جو تمہارے جرائم کی وجہ سے تم پر آنے والی ہے اور اس طرح تمہیں ایک مدتِ معینہ تک زندگی کی کامرانیوں اور خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہونے کا موقع عطا کر دے۔

اس کے جواب میں وہ کہتے کہ تم ہماری طرح کے ایک انسان ہو (اس لیے تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے کہ تمہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے)، تم چاہتے ہو کہ جن ہستیوں کی اطاعت و عبودیت ہمارے اسلاف نے اختیار کر رکھی تھی، ان سے ہمیں روک دو (تاکہ ہم تمہارا مسلک اختیار کر لیں)

نیز، انہوں نے کہا کہ تم اِن دلائل اور تاریخی شہادات کو چھوڑو۔ تم جو کہتے ہو کہ تمہاری یہ دعوت ضرور غالب آئے گی، تو اسے غالب کر کے دکھاؤ — اس طرح غالب کر کے کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے — (اُس وقت ہم دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔)

اس آیت میں ایک تو مخالفین کا یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے کہ تم ہمارے ہی جیسے انسان ہو، پھر تم خدا کے رسُول کیسے ہو سکتے ہو؟ (وہی قدیمی اعتراض!) دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ — اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تمہاری تحریک غالب آئے گی، تو اسے غالب کر کے دکھاؤ۔ اس میں تاخیر کیوں کر رہے ہو اور دوسرے معانی یہ ہو سکتے ہیں کہ ہمیں کوئی کھُلا ہُوا معجزہ دکھاؤ۔ اس کے جواب میں اُنہوں نے کہا کہ:

۱۱/۱۴ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

ان کے رسولوں نے اُن سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم تمہارے ہی جیسے انسان ہیں لیکن خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق،

اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، نبوّت بطور موہبت عطا کر دیتا ہے۔ باقی رہا غلبہ وتسلّط، سو وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ (وہ کب حاصل ہوگا، یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس کا ہمیں یقین ہے کہ وہ حاصل ضرور ہوگا۔ ہمیں قانونِ خداوندی کی محکمیّت پر پورا پورا بھروسہ ہے اور یہ صرف ہم پر ہی موقوف نہیں)، جو لوگ بھی قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، انہیں اس کی محکمیّت پر پورا پورا بھروسہ ہے۔

آیت کے پہلے حصّہ میں ان کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ ایک بشر، رسول کس طرح ہو سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ نبوّت انسان کا اکتسابی ملکہ نہیں۔ یہ موہبتِ خداوندی ہے (تفصیل نبوّت اور وحی کے عنوانات میں گزر چکی ہے) دوسرا جواب سلطان کے متعلق ہے۔ سو یہاں بھی اس سے مراد "غلبہ اور کامیابی" اور معجزہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ دوٹوک بات بہرحال یہی تھی کہ ہمارا بھروسہ قوانینِ خداوندی پر ہے اور چونکہ وہ قوانین محکم ہیں اس لیے ہمیں اپنے دعاوی پر پورا پورا یقین ہے۔ ان قوانین پر بھروسہ اور اعتمادِ کامل کیوں ہے؟

۱۴/۱۲ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ ہم اس کے قانون کی محکمیت پر اعتماد نہ کریں جبکہ اس نے زندگی کی مختلف راہوں کو ہمارے سامنے اس طرح واضح طور پر بے نقاب کر دیا ہے (کہ ہر حقیقت واشگاف ہو کر ہمارے سامنے آگئی ہے)، اُس کے قانون کی محکمیت پر اعتماد ہی تو ہے جس کی وجہ سے ہماری کیفیت یہ ہے کہ تم ہمیں جس قدر اذیتیں پہنچاؤ گے ہم انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے اور ان سے ہمارا قدم کبھی نہیں ڈگمگائے گا۔

جب خدا کا قانون اس قدر محکم ہے تو ہر بھروسہ کرنیوالے کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

سبیل کی بجائے سُبُل (جمع) کی تشریح مطالب الفرقان جلد اوّل (ص۲۲ پر) کی جا چکی ہے۔ دوسرے مقام پر ہے کہ جو ہماری طرف آنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے ہم اُسے سُبُل کی طرف راہنمائی کر دیتے ہیں (۲۹/۶۹)، منزل وہی رہتی ہے، (جسے خدا نے متعیّن کر دیا ہے) یعنی اس کی طرف جانے والی شاہراہ (صراطِ مستقیم) بھی ایک ہی ہے۔ لیکن حالات کے مطابق پگڈنڈیاں (طریقِ کار) مختلف ہو سکتی ہیں جو بالآخر اس شاہراہ میں جا کر مل جاتی ہیں۔ لیکن پگڈنڈی ہو یا شاہراہ، یہ سفر اسی اعتماد کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے کہ یہ سب ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دیں گی۔ ان (مخالفین) کی طرف سے وہی جواب ملتا رہا جو ہر سرکش، مستبد کا وطیرہ ہے۔

۱۴/۱۳ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ

اس پر ان لوگوں نے جو قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے تھے، اپنے رسولوں سے کہا کہ (ہم زیادہ باتیں سننے کے لئے تیار نہیں)۔ یا تو (چپکے سے) ہمارا مسلک اختیار کر لو ورنہ ہم تمہیں اپنی سرزمین سے باہر نکال دیں گے۔

اُنہوں نے یہ کہا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاءؑ سے کہا:

۱۴/۱۳-۱۵ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ وَ اسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾

انہوں نے انہیں یہ دھمکی دی اور ان کے نشوونما دینے والے نے انہیں بذریعہ وحی کہہ دیا کہ (گھبراؤ نہیں) ہم ان ظلم و زیادتی کرنے والوں کو تباہ کر دیں گے۔ اور ان کی تباہی کے بعد، تمہیں ان کے ملک میں آباد کر دیں گے (یہ کچھ اس لیے نہیں ہوگا کہ ہمیں تمہاری طرف داری مقصود ہے اور ان سے یونہی عداوت ہے۔ یہ سب ہمارے اٹل قانون کے مطابق ہوگا) اور ہر اس قوم کے حق میں ایسا ہی ہوگا جو جانتی ہے کہ کائنات میں قانونِ خداوندی کا مقام کیا ہے اور اس قانون کے خلاف چلنے کا نتیجہ کیا۔ اور وہ اس نتیجہ سے خائف رہتی ہے۔

چنانچہ وہ لوگ دلائل و براہین سے نہ مانے اور انہوں نے چاہا کہ ایک فیصلہ کن بات سامنے آجائے، تو وہ آگئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہر سرکش اور باغی (جس نے قانونِ خداوندی کا مقابلہ کیا تھا) ناکام و نامراد رہا۔

یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بعض رسولوں نے تو مملکت قائم کی تھی لیکن بعض ایسے بھی تھے جنہیں مملکت اور حکومت قائم کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ زیرِ نظر آیات میں بات تمام رسولوں کے متعلق ہو رہی ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ انہیں ان کے مخالفین کی تباہی کے بعد، ان کی جگہ متمکن کیا گیا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ مخالفین کی بربادی کے بعد خدا کے رسول ان کی جگہ متمکن ہُوئے تھے اور انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ اقتدار کسی وسیع و عریض مملکت میں ہی قائم ہو۔ یہ کسی محدود خطۂ ارض میں بھی ہو سکتا تھا۔ قرآن کی یہ شہادت بہرحال یقینی ہے کہ اپنے مخالفین کی تباہی کے بعد یہ ان کی جگہ متمکن ہُوئے تھے۔ اگر کسی مقام پر تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی تو یہ تاریخ کی کوتاہی ہے اور اگر قرآنِ حکیم میں ہر رسول کے سلسلہ میں اس کی تفاصیل نہیں آئیں تو یہ اس لیے کہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں۔ یہ کتابِ ھُدیٰ ہے اور یہ اتنا ہی بیان کرتا ہے جتنا ہدایت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ اصول ہمیشہ یاد رکھنا

چاہیے کہ جب بھی عام تاریخ اور قرآن کے بیان کردہ کسی اصول یا تصریح میں تضاد ہو تو قرآن کے بیان کو مبنی بر صداقت کہنا چاہیئے۔ ہمارا ایمان قرآن پر ہے نہ کہ تاریخ پر۔ (انڈکس میں تاریخ کا عنوان دیکھیئے)۔

یہاں دو غیر متبدل اصول بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ظالم، جبّار، عنید (مستبد، سرکش، آمر حکمران) آخرالامر ناکام رہتے ہیں اور جو لوگ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے محتاط رہتے ہیں، کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ غیر متبدل قانونِ خداوندی ہے۔ ان نتائج کے برآمد ہونے میں وقت تو لگتا ہے لیکن ایسا ہو کر رہنا یقینی ہے۔ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ۔ ایک ابدی اصول اور غیر متبدل قانون کی طرف اشارہ کرتا ہے ــــ جو بھی ایسا کرے گا اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔

حکومت اور اقتدار، دولت اور حشمت کا چھن جانا ہی کچھ کم عذاب نہیں ہوتا، لیکن اس سے بھی زیادہ شدید عذاب ایک اور ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے 'محکومی اور غلامی' ذلّت و پستی کی زندگی۔ یعنی اس شکست اور ناکامی سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ قوم صفحۂ ہستی سے معدوم ہوجائے۔ وہ زندہ رہتی ہے اور یہ زندگی اس کے لیے زیادہ شدید عذاب کا سبب بنتی ہے۔

متعدد مقامات پر بتایا جاچکا ہے کہ اُخروی زندگی کی جنّت اور جہنّم برحق ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن حکیم کی رُو سے، جنّت اور جہنّم کی زندگی اس دنیا ہی سے شروع ہوجاتی ہے (انڈکس میں عنوانات دیکھیئے جنّت اور جہنّم) زیرِ نظر آیات میں محکوم قوموں کی اسی دنیا کی جہنّم کی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ غور کیجیے کہ محکوم کی زندگی کا قرآن نے کیسا عبرت آموز نقشہ کھینچا ہے۔ فرمایا:

(۱۴/۱۶-۱۷) مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

(اور یہ ناکامی اور نامرادی وقتی نہ تھی، بلکہ یہ) ایک مستقل عذاب تھا جو ان کے پیچھے لگ گیا۔ اس ذلّت کی زندگی میں انہیں کھانے کو ملتا تھا لیکن بجائے اس کے کہ اس سے ان کی نشوونما ہوتی، وہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما میں اُلٹا روک بن جاتا تھا۔

(انہیں اس ذلّت کی زندگی کا احساس تھا۔ اس لیے) یہ سامانِ زیست ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترتا تھا۔ لیکن اسے طوعاً وکرہاً اسے نگلنا پڑتا تھا۔ انہیں چاروں طرف سے موت کے سامان دکھائی دیتے تھے (اور وہ چاہتے بھی تھے کہ انہیں موت آجائے تاکہ اس عذاب سے چھٹکارا ہوجائے) لیکن انہیں موت بھی نہیں آتی تھی (۱۴/۸۷ نیز ۲/۱۲) بلکہ

موت آنے کی بجائے اس عذاب کی شدت اور بڑھ جاتی تھی ـــ دائف! ذلت اور محکومی کا عذاب بھی کس قدر الم انگیز اور جانگسل ہوتا ہے!)

یہ عذاب اس دنیا کا تھا۔ اُخروی زندگی کا عذاب اس سے بھی زیادہ جانکاہ ہوگا۔ اصل جہنم کی غذا کی مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے۔ (۴۴/۴۹ و ۵۶/۵۲-۵۵)

یہاں کہا ہے کہ اس زندگی میں موت ہر طرف سے آتی دکھائی دے گی لیکن وہ مریں گے بھی نہیں۔ دوسری جگہ ہے لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى۔ (۲۰/۷۴ و ۸۷/۱۳) وہ نہ زندہ ہوں گے نہ مُردہ۔

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ محکومی کی زندگی تو ایک طرف، اس کی موت بھی ہزار عبرت کا موقع ہوتی ہے۔ ارمغانِ حجاز میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "قبر"۔ (اپنے مُردہ سے) قبر کہتی ہے:

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا؟ میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک

تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک

الحذر! محکوم کی میت سے سو بار الحذر!

اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک

یہ ہے محکوم کی جہنم کی زندگی اور اس کی ذلت آمیز موت! واضح رہے کہ دنیا کے عام نقطۂ نظر سے ایک قوم پر اگر کوئی دوسری قوم حاکم ہو تو وہ قوم محکوم کہلائے گی لیکن قرآنی نقطۂ نگاہ سے اگر کسی قوم پر کتاب اللہ کے سوا کسی کی حکمرانی ہو تو وہ محکوم ہے، خواہ وہ حکمرانی خود اپنی قوم ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی تمام "آزاد" قومیں ہزار سال سے محکوم کی محکوم چلی آرہی ہیں۔ اسلام میں' انسانوں پر انسانوں کی حکومت، خواہ کسی شکل میں ہو، غلامی اور محکومی ہے۔ آزادی صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت کا نام ہے۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

ان لوگوں کے اعمال کے متعلق کہا:

(۱۴/۱۸) مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾

(اور یہ چیز صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں) جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی سے انکار کر کے غلط راستوں پر چل نکلتے ہیں (وہ

کہیں ہوں اور کسی زمانے میں ہوں، ان کے اعمالِ زندگی کی مثال یوں سمجھو جیسے ہلکی سی راکھ ہو جس پر آندھی کے دن، زور کا جھکڑ چلے اور وہ ساری راکھ اُڑ کر کہیں کی کہیں چلی جائے اور اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے (ان کے اعمال، کوئی ٹھوس تعمیری نتیجہ مرتب نہیں کرتے، اس لیے وہ رائیگاں جاتے ہیں)

غور کرو کہ انسان کی ناکام اور بے نتیجہ کوششوں کی اس سے بُری مثال اور کیا ہوگی۔

حبطِ اعمال قرآن کی اہم اصطلاح ہے۔ اس کے مفہوم کے لیے دیکھئے مطالب الفرقان، جلد چہارم ص۴۲، اور جلد پنجم ص۱۶۵۔ یہ اس لیے کہ کائنات کی مشینری تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لیے قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ جو کام ان قوانین کے مطابق نہیں ہوں گے وہ اس پروگرام میں فٹ نہیں بیٹھ سکیں گے اس لیے تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکیں گے۔

اس سلسلہ میں کہا:

۱۴/۱۹ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ

(یہ اس لیے کہ ان کی زندگی کا نقشہ کائناتی نقشہ کے یکسر خلاف ہے) کائناتی نظام پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہاں ہر شے تعمیری نتیجہ مرتب کرتی ہے۔

۱۴/۱۹—۲۰ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ۝۱۹ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ۝۲۰

(اور جس چیز میں اس کی صلاحیت نہیں رہتی وہ ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایسی چیز لے لیتی ہے جس میں اس قسم کی صلاحیت ہوتی ہے) لہٰذا ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے اعمال تعمیری نتائج پیدا نہیں کریں گے تو تم کائناتی نقشہ میں فٹ نہیں بیٹھ سکو گے اور خدا کا کائناتی قانون تمہیں نکال کر باہر پھینکے گا اور تمہاری جگہ نئی مخلوق لے آئے گا (۶/۱۳۳؛ ۹/۳۹؛ ۴۷/۳۸)

اور ایسا کرنا خدا کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

قرآنِ کریم میں ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لے آنے کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے (دیکھئے انڈکس بالخصوص ۹/۳۹؛ ۴۷/۳۸) لیکن خدا کے لیے یہ بھی مشکل نہیں کہ اگر ساری کی ساری نوعِ انسانی غلط راہوں پر چل نکلے تو ان کی جگہ ایک نئی مخلوق لے آئے۔ (جیسا کہ آیت ۶/۱۳۳ میں بالتصریح آیا ہے) زیرِ نظر آیت میں قومِ مخاطب کا استبدال بھی منصور ہو سکتا ہے اور نوعِ انسانی کا استبدال بھی۔ قومی استبدال کا مفہوم لینے سے اگلی آیات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

۱۴/۲۱ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ

هَدٰنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾

(ابھی تو وہ انتظار کا وقفہ ہے جس میں آخری فیصلہ کن تصادم کی تیاری ہوتی ہے۔ جب یہ وقفہ گزر جائے گا) اور سب قانونِ خداوندی کا مقابلہ کرنے کے لیے نکھر کر میدان میں آجائیں گے اور وہ وقت ہوگا جب (مضمر، چھپے ہوئے نتائج محسوس (مشہود اور بارز) شکل میں سامنے آجائیں گے تو اس وقت اس تباہی کو دیکھ کر کمزور لوگ (یعنی عوام جو لیڈروں کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں) اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے، تو آج کیا تم ایسا نہیں کروگے کہ اس تباہی سے بچنے کی کوئی سبیل پیدا کر دو؟ وہ کہیں گے کہ اگر ہمیں اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر آتی تو ہم تمہارے بچاؤ کی بھی کوئی شکل بتاتے۔ (لیکن اب تو حالت یہ ہے کہ) ہمیں خود اپنے بچاؤ کی بھی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی، اس لیے تمہیں کیا بتائیں؟ اب تو وہ وقت آچکا ہے کہ خواہ ہم اپنی روش پر بدستور چلتے جائیں خواہ اسے چھوڑ دیں، نتیجہ یکساں ہے۔ اب اس تباہی سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ (۳۳/۶۷ ؛ ۳۴/۳۲ ؛ ۳۷/۲۷-۲۹ ؛ ۳۸/۶۰ ؛ ۴۰/۴۷)

جہنم میں لیڈروں اور پیش رووں کے مکالمات کے لیے وہ آیات دیکھیے جن کے حوالے اُوپر مفہوم میں دیے گئے ہیں۔
نیز مطالب الفرقان۔ جلد چہارم (صفحہ ۵۴۹) ؛ جلد پنجم (صفحہ ۱۹۲)۔

اور اس کے بعد شیطان!

(۱۴/۲۲) وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اور جب اس تصادم کا آخری فیصلہ ہو چکے گا تو شیطان (یعنی انفرادی مفاد پرستیوں کا باطل نظام، جس پر یہ لوگ چلے آ رہے تھے) کہے گا کہ ایک بات تم سے نظامِ خداوندی نے کہی تھی، سو وہ بات حقیقت بن کر تمہارے سامنے آگئی۔ اور ایک بات تم سے میں نے کہی تھی تو واقعہ اس کے خلاف ہوا۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی قوت نہیں تھی

کہ میں تمہیں اپنے پیچھے زبردستی لگا لیتا۔ جو کچھ ہُوا وہ صرف یہ ہے کہ میں نے تمہیں آواز دی تو تم نے اس پر فوراً لبّیک کہہ دیا اور اس طرح میرے بلاوے کو قبول کر لیا۔ لہٰذا تم مجھے الزام مت دو۔ خود اپنے آپ کو الزام دو۔ اب میں بھی چیخ پکار کرتا ہوں (کہ میں گیا) اور تم بھی چیخ و پکار کر رہے ہو (کہ تم تباہ ہوئے۔ سارا معاشرہ کہرام مچا رہا ہے۔ چھوٹے بڑے سب دہائی دے رہے ہیں لیکن)، نہ میں ہی تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں، نہ تم ہی مجھے بچا سکتے ہو۔ تم نے، اس سے پہلے جو یہ روش اختیار کر رکھی تھی کہ میرے قوانین و احکام کی اطاعت، قوانینِ خداوندی کی طرح کیا کرتے تھے، میں تمہاری اس روش سے بری الذمہ ہوں (اسے تم نے خود ہی اختیار کیا تھا) حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتیں، اُن کے لیے الم انگیز تباہی ہوتی ہے۔

شیطان (اور ابلیس) کا ذکر سابقہ جلدوں میں بکثرت آچکا ہے۔ ان کی ماہیت کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد دوم (صفحہ ۵، صفحہ ۹۹ پر) تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ یہاں صرف ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم اپنے ہر غلط کام کو شیطان کی طرف منسوب کر کے خود بری الذمہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چونکہ شیطان خود ہمارے اپنے ہی سرکش جذبات کا نام ہے اس لیے غلط کاموں کے لیے کسی اور کے ذمہ دار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں (بغرضِ تفہیم) "شیطانؔ کو ایک جُدا گانہ ہستی قرار دے کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ غلط کاموں کا ذمہ دار شیطان نہیں ہوتا، تم خود ہوتے ہو! انسان کے سرکش جذبات، اسے غلط کاموں کے لیے اُکساتے ہیں (اسے اس کی دعوت دیتے ہیں) اور یہ ان کی دعوت پر لبّیک کہہ دیتا ہے۔ ذمہ دار بہرحال یہ خود ہی ہوتا ہے اس لیے ان کا خمیازہ بھی خود ہی بُھگتتا ہے۔

ان کے برعکس، وہ قوم ہے جس کی زندگی قوانینِ خداوندی کے مُطابق بسر ہوتی ہے۔

[۱۴/۲۳] وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

ان کے برعکس، جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھ کر، اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے، انھیں شادکامیوں اور کامرانیوں کی جنّت میں داخل کیا جائے گا جس کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آئے گی اور یہ سب کچھ خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق ہوگا۔ اس (جنّتی معاشرہ) میں ہر ایک کی آرزو اور کوشش یہ ہوگی کہ وہ دوسروں کے لیے، زیادہ سے زیادہ زندگی اور سلامتی کا سامان بہم پہنچائے۔

یہ دو جماعتیں ہیں بلکہ دو نظریاتِ زندگی ہیں جن کے یہ ثمرات ہیں۔ اسے مثال کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔

(۱۴ — ۲۴ — ۲۵) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

ذرا غور کرو کہ اِن ہر دو متضاد نظریاتِ حیات اور نظام ہائے زندگی کو خدا کس طرح ایک مثال کے ذریعے واضح کرتا ہے۔ خوشگوار نظریہ زندگی کی مثال ایک ایسے عمدہ پھل دار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں (پاتال میں) محکم اور استوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں (یعنی اسے معاشی زندگی میں مادی تمکن بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ بلند اخلاقی اقدار سے بھی ہم کنار ہو جن کا سرچشمہ مادی کائنات سے ماوراء ہے) وہ درخت قانونِ خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں، ہر وقت پھل دیئے جاتا ہے۔ اللہ اس طرح تجریدی اور نظری حقائق کو، محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں۔

یہ مثال بڑی جامع ہے جس میں اسلام کی اصل و اساس سمٹ کر آگئی ہے۔ قوموں کی زندگی کا راز اس نظریہ میں مضمر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے معاشرہ کی عمارت استوار کرتی ہیں۔ ایک نظریۂ حیات وہ ہے جو مادی کائنات اور اقدارِ خداوندی دونوں پر پرورش پاتا ہے۔ تسخیرِ کائنات سے وہ مادی قوتوں کو مسخر کر لیتا ہے اور پھر ان قوتوں کو اقدارِ خداوندی کے مُطابق (نوعِ انسان کی نشو ونما کے لیے) استعمال کرتا ہے۔ اس نظریہ کے زندگی بخش اور حیات افزا نتائج مستقلاً برآمد ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی جب تک کوئی قوم اس پر عمل پیرا رہتی ہے اس کی برکات سے فیض یاب ہوتی رہتی ہے۔ دوسری جگہ اس کے متعلق کہا اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (۱۳/۳۵)۔ اس کا سایہ بھی دائمی ہوتا ہے اور پھل بھی۔ جنتی معاشرہ کے پھلوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ چھوٹے بڑے ہر ایک کی دسترس میں ہوتے ہیں، ان تک ہر ایک کی رسائی ہوتی ہے۔ سب یکساں طور پر اُن سے متمتع ہوتے ہیں۔ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ۔ (۶۹/۲۳)۔ اس کے درختوں کی پھلوں سے لدی ہوئی شاخیں یوں سمجھو گویا ہر ایک کی جھولی میں ہوتی ہیں۔ وہ پھل از خود تمام افرادِ معاشرہ تک پہنچتے ہیں۔ فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۙ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ۔ (۵۶/۳۲-۳۳)۔ پھل بڑی کثرت سے ہوں گے اور ان کے راستے میں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مُطابق میسر ہوں گے۔ یہ تو جنتی معاشرہ (نظامِ سرمایہ داری) ہے جس میں پھل تو بکثرت ہوتے ہیں لیکن باغوں پر پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں کہ کوئی محتاج اور ضرورت مندان کے قریب تک نہ آنے پائے۔ سورۃ القلم اور سورۃ کہف (۶۸/۱۷-۲۴؛ ۱۸/۳۲-۴۲) میں باغ والوں کی مثال سے واضح کیا گیا ہے۔

سو خوشگوار نظریۂ زندگی کے ثمرات بھی قائم و دائم ہوں گے اور ان سے متمتع بھی بلا امتیاز تمام انسان ہوں گے۔ یہ ہے اسلامی نظامِ زندگی کا نقشہ اور قرآنی نظریۂ حیات کا مآل!

اس کے برعکس:

(۱۴ : ۲۶) وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

اس کے برعکس، غلط نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کی مثال، ایک ایسے نکمّے درخت کی سی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ، زمین کے اوپر ہی اوپر ہو، کہ اُسے جب جی چاہے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ (جو غلط نظام، اخلاقی اقدارِ خداوندی سے ہمکنار نہیں ہوتا، اسے ثبات و قرار نصیب نہیں ہوتا)۔

اس لئے کہ — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا!

اِن ہر دو نظریاتِ حیات کے فرق کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ طیّب نظریۂ حیات کی یہ کیفیت ہے کہ جب تک کوئی قوم اس پر عمل پیرا رہے گی وہ اسے اپنے ثمرات سے متمتع کرتا رہے گا۔ خبیث نظریۂ حیات کی یہ حالت ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے کے باوجود قوم زندگی کے حقیقی خوشگوار ثمرات سے محروم رہے گی۔ "خوشگوار ثمرات" سے مراد طبیعی اسباب و وسائل کی کثرت ہی نہیں، ان سے حاصل ہونے والا امن و سکون اور اطمینان و سلامتی بھی ہے جو غیر خداوندی نظریہ سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

طیّب نظریۂ حیات مفصلاً قرآنِ کریم ہے اور مجملاً لَآ اِلٰـهَ - اِلَّا اللّٰهُ (حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں)۔ یہ شرف و مجدِ انسانیت کا ضامن ہے۔ طیّب نظریۂ حیات پر کاربند رہنے والی قوم کی حالت کیا ہوتی ہے:

(۱۴ : ۲۷) يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ ﴿۲۷﴾

اس طرح اللہ، اس محکم نظریۂ زندگی کی رُو سے، ایمان والوں کی جماعت کو، ان کی دنیاوی اور اُخروی زندگی (دونوں) میں، ثبات اور تمکن عطا کر دیتا ہے اور جو لوگ اس نظام سے سرکشی برتتے ہیں، ان کی کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔

یہ سب کچھ اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

چونکہ وہ قوم قولِ ثابت (محکم نظریۂ حیات)، پر کاربند ہوتی ہے اس لیے اُسے زندگی میں ثبات و استحکام حاصل ہوتا ہے۔

اس دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ ہے قرآنی نظریۂ حیات کی امتیازی خصوصیت۔ یہ دنیا بھی حسین اور تابناک اور اُخروی زندگی بھی درخشندہ و تابندہ۔ یہ کچھ یونہی اتفاقیہ نہیں ہو جاتا، خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے جو ابدی اور غیر متبدل ہے۔ یہی اس نظریہ کے ثبات اور اس کی حامل قوم کے استحکام کی دلیل ہے۔

لیکن کَلِمَۃً طَیِّبَۃً (خوشگوار نظریۂ حیات) یہ کچھ از خود ہی نہیں کر دیتا۔ جب انسان اس پر عمل پیرا ہوں تو پھر اپنے نتائج مرتب کرتا ہے۔ سورۃ فاطر میں اس عمیق حقیقت کو بڑے برجستہ انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ فرمایا: اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (۳۵/۱۰) کلمۂ طیب میں اُوپر کو اُٹھنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن اُسے بلند انسان کے اعمالِ صالح ہی کرتے ہیں۔ نہ نظریۂ زندگی بلا انسانی اعمال نتیجہ خیز ہوتا ہے، نہ انسانی اعمال بلا نظریۂ حیات برومند ہو سکتے ہیں۔ سورۃ انفال کی آیت (۸/۱۷) — وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ — میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔ خدا کا متعین کردہ نظریۂ زندگی اور بندۂ مومن کے ہاتھ کا تعاون — کا مطلب واضح ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جو قومیں غیر خداوندی نظریات پر عمل پیرا ہوتی ہیں، ان کے لیڈر انہیں تباہی اور بربادی کے جہنّم کی طرف لے جاتے ہیں۔

۱۴/۲۸—۲۹ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَہُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَہَنَّمَ یَصْلَوْنَہَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾

(اب تم اس قانونِ مشیت کو سامنے رکھ کر اقوامِ عالم کی تاریخ پر نگاہ ڈالو اور) ان راہنمایانِ قوم کی حالت پر غور کرو جنھیں اللہ نے زندگی کی خوشگواریاں اور فراوانیاں عطا کیں۔ لیکن انہوں نے ان کی قدر نہ کی (ان کا غلط استعمال کیا) اور اپنی ملت کے کارواں کو ایسی منڈی میں لا کر ٹھہرا دیا جس میں ہر طرف کساد بازاری تھی۔ جہاں ان جنس کا سد کا کوئی خریدار نہ تھا۔ یعنی انہیں تباہی اور بربادی کے جہنّم میں جھونک دیا۔ اور یہ کیسی بُری جگہ تھی جہاں انہوں نے اس قافلے کو اُتارا!

غور فرمایئے، قرآن نے تاریخِ انسانیت کو کس طرح چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ کوزہ میں محصور ہوا اضطراب دریا کا — اور یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ قوموں کی زندگی میں جہنّم سے کیا مراد ہوتی ہے؛ قوم کی کس مپرسی، بے قدری، خستہ حالی۔ ذلت و خواری کی زندگی جس تک اُس کے راہنماؤں نے اُسے پہنچا دیا ہو۔

اُنہوں نے یہ کیسے کیا؟

۱۴/۳۰ وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا لِّیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِہٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا

فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

اُنہوں نے کیا یہ کہ (نام تو لیتے رہے قوانینِ خداوندی کا، لیکن) اس کے ہم پایہ ٹھہرانے رہے غیر خداوندی قوانین کو، تاکہ اس طرح لوگوں کو، خُدا کے تجویز کردہ راستے سے بہکا کر، دُوسرے راستے پر ڈال دو۔ تم اِن لوگوں سے کہہ دو کہ تم نے بھی ایسی روش اختیار کر رکھی ہے۔ سو اس سے تھوڑے دنوں تک فائدے حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تمہارے لیے بھی تباہی اور بربادی ہے۔

اُوپر بتایا جا چکا ہے کہ خوشگوار نظریۂ حیات (کلمۂ طیّب) لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اِنسان قوانینِ الٰہیہ کے سِوا کسی کا محکوم نہیں۔ اِس سے وہ مقامِ انسانیّت پر فائز ہوتا ہے۔ یہی توحید ہے۔ باطل نظریات کے حامل، انسانوں کو بھی حکمران قرار دیتے ہیں۔ یہ شرک ہے، جو وجہ تذلیلِ انسانیّت ہے۔ (جیسا کہ شرک کے عنوان کے تحت آپ، مطالبُ الفرقان کی مختلف جلدوں میں دیکھ چکے ہیں) نہ توحید پر ایمان سے خدا کا کچھ سنورتا ہے، نہ شرک سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ ان کا تعلق خود انسان کے سنورنے اور بگڑنے سے ہے۔ شرک سے کچھ عرصہ کے لیے دُنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس نظریّہ سے انسان اپنے مقام سے گِر جائے اس کا نتیجہ ذلّت و رسوائی کے سوا کیا ہو سکتا ہے!

اِن کے برعکس، کلمۂ طیّب کے حاملین کے متعلّق فرمایا:

(۱۴ / ۳۱) قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

اِن کے برعکس، تم میرے اِن بندوں سے، جو میرے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، کہہ دو کہ (وہ اس سے نہ گھبرائیں کہ باطل کا نظام ہر طرف مسلّط ہے اس لیے، اس سے کس طرح نکلا جائے گا؟) وہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ انہیں دے رکھا ہے — وہ ان کی مضمر صلاحیتیں ہوں یا محسوس سامانِ زیست — اُسے حسبِ موقع و ضرورت، علانیہ اور پوشیدہ، اِس بلند مقصد کے لیے صرف کرتے چلے جائیں، ابھی تو اس کا موقع ہے۔ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر مشکل ہو جائے گی۔ اس لیے کہ یہ جنس وہ نہیں ہے جسے، جب

جی چاہے، بازار سے خرید لیا جائے یا کسی دوست سے احساناً مانگ لیا جائے۔ اسے تو موقع پر خونِ جگر سے حاصل کیا جاتا ہے)۔ (۲/۲۵)

اِس کا تعلق قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے۔ اس کی تشریح مطالبُ الفرقان۔ جلد دوم (صفحہ ۲۲۸) اور جلد سوم (صفحہ ۴۳۱) پر دیکھیے۔ اگرچہ یہ موضوع (مکافاتِ عمل) سابقہ جلدوں میں پھیلا ہُوا ہے کہ قرآنی تعلیم اور دعوت کا نقطۂ ماسکہ یہی ہے، اسی پر نظامِ ربوبیت کی بُنیاد ہے جو تمام کائنات کو محیط ہے۔

(۱۴/۳۲—۳۳) اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۚ ﴿۳۳﴾

اِس طرح انسانی دنیا میں وہ نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے گا جس کے اسباب و ذرائع خارجی دُنیا میں پہلے سے مہیا کر دیے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے خدا نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے جس کی آبیاری سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں تاکہ وہ تمہارے لیے سامانِ زیست بنیں۔ اس نے تمہارے لیے کشتیوں (اور جہازوں) کو مسخر کر دیا تاکہ وہ اس کے قانون کے مطابق سمندروں میں چلتے رہیں اور تمہارے لیے دریا بھی مسخر کر دیے (تاکہ تم ان سے آب پاشی کا کام لے سکو)

اور اس نے تمہارے لیے چاند اور سورج کو بھی قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ وہ ایک مقررہ قاعدے کے مطابق، برابر چلے جا رہے ہیں۔ نیز اس نے تمہارے لیے دن اور رات کو بھی مسخر کر دیا۔

یہ (نظامِ کائنات) اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ انسانوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی میسر آتی رہیں۔

(۱۴/۳۴) وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

غرضیکہ اس طرح اس نے، (اپنے کائناتی قانونِ ربوبیت کے مطابق) تمہیں وہ سب کچھ دے دیا جس کی تمہیں، اپنی نشوونما کے لیے ضرورت ہے (۵۵/۲۹)۔ یہ سامانِ رزق اس قدر متنوع اور فراواں ہے کہ اگر تم اسے گننے لگو تو اس کا احاطہ نہ کر سکو (یہ سامانِ رزق ہم نے تمام انسانوں کی عالمگیر پرورش کے لیے دیا تھا۔ لیکن انسانوں نے اسے اپنے قبضے میں لے کر، ایسی دست درازیاں شروع کر دیں کہ) ہر ایک دوسرے کے حقوق چھیننے لگا اور جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا، اُسے دبا کر بیٹھ گیا۔

خدا نے سامانِ زیست، بلا حدود و قیود ساری دُنیا میں پھیلا دیا تھا۔ لیکن انسانوں نے اس کی تقسیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جس سے تمام ناہمواریاں وجود میں آگئیں۔ اس طرح بالادست انسانوں کی دست درازیوں سے نظامِ ربوبیت تہ و بالا ہو گیا۔

سرکش اور بالادست انسانوں کے اس ظلم و جور اور سلب و نہب کو روکنے کے لیے خدا نے انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ شروع کیا تاکہ ان کے ہاتھوں نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے۔ ان میں حضرت ابراہیمؑ کو ایک خاص مقام حاصل ہے کیونکہ اُنھوں نے مقامی حدُود سے نکل کر عالمگیر انسانیت کے نظام کی بُنیاد رکھی تھی جس کا مرکز کعبہ تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی داستانِ جلیلہ سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ (انڈکس میں دیکھیے عنوانات ابراہیمؑ اور کعبہ) یہاں ان کی اس دُعا کا ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے تعمیرِ کعبہ کی تکمیل کے بعد مانگی تھی۔

(۱۴/۳۵) وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾

سرکش انسانوں کی ان دست درازیوں اور ناہمواریوں کی روک تھام کے لیے، ابراہیمؑ نے نظامِ خداوندی کی بُنیاد رکھی اور اس کے لیے ایک مرکز قائم کیا۔ (۲/۱۲۵) اور اس سلسلہ میں خدا سے دُعا کی کہ اے نوعِ انسان کو نشوونما دینے والے! تو اس بستی کو (جسے میں نے تیرے نظام کا مرکز قرار دے دیا ہے) ایسا بنا دے کہ یہ سرکش اور مستبد قوتوں کے ستائے ہوئے انسانوں کے لیے مقامِ امن بن جائے اور مجھے اور میری اولاد کو (جو اس مرکز کی محافظ ہوگی)، اس کی توفیق عطا فرما کہ ہم ہر اُس کام اور اُس شے سے مجتنب رہیں جو تیرے قانون کی اطاعت کے راستے میں حائل ہوں، اور ہمیں تجھ سے بیگانہ بنا دے۔

صنم (جمع اصنام) کا ترجمہ عام طور پر "بُت" کیا جاتا ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے۔

امام راغب (اپنے مفردات میں) کہتے ہیں کہ "ہر وہ چیز جو انسان کو خدا سے بیگانہ کر دے اور اس کی توجہ کسی دوسری طرف پھیر دے، صنم کہلاتی ہے"۔ انھوں نے مزید کہا ہے کہ "حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا مانگی تھی کہ مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی عبودیت اختیار کرلیں تو اس سے مراد ایسی ہی خواہشات(۱۹/۵۹) کے پیچھے لگ جانا تھا کیونکہ انھیں اس کا خدشہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اور اُن کی اولاد بُتوں کی پرستش شروع کر دے گی"۔(لغات القرآن (پرویز۔ صفحہ ۱۰۲۰)۔ یہی وہ اصنام ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

رہ مدہ اقبالؔ را در کعبہ اے شیخ حرم!　　ہر زماں در آستیں وارد خداوندے دگر

اور یہ کہ:

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر　　رُست از یک بند تا اُفتاد در بندِ دگر

حضرت ابراہیمؑ کے استعارے کے طور پر:

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لَآ اِلٰہ میں ہے

اس اعتبار سے دیکھیے تو ہم سب اصنام پرست ہیں۔ لَآ اِلٰہ سے مراد مٹی اور پتھر کی مورتیوں کو توڑنا ہی نہیں، ان تمام خواہشات، مقاصد، مفادات اور رجحانات کو دل کے صنمکدہ سے نکال باہر کرنا بھی ہے جو اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کی راہ میں حائل ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہی دعا ہمارے لیے مانگی تھی کہ ملّتِ ابراہیمیؑ کے پیرو ہونے کی جہت سے ہم بھی ان کی معنوی ذرّیت میں شامل ہیں۔

اصنام کا مندرجہ بالا مفہوم اگلی آیت نے واضح کر دیا جب کہا کہ:

(۱۴/۳۶) رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

اے میرے نشو و نما دینے والے! ان غیر خدائی قوتوں اور جاذبیتوں نے، بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے (اور یہ جو میں نے دعا کی ہے کہ میری اولاد کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا ہو تو یہ اس لیے کہ اگر وہ تیرے راستے پر چلے گی تو اس نظام کے مرکز کی تولیت کی اہل رہے گی۔ اگر وہ اس راستے پر نہ چلے گی تو محض میری اولاد ہونا اسے اس کا اہل نہیں بنا سکے گا۔ (۲/۱۲۴)۔ اس نظام میں "اپنے" اور بیگانے کا معیار ہی بدل جاتا

ہے) میرا "اپنا" وہ ہوگا جو اس مسلک کا اتباع کرے گا جس پر میں چلتا ہوں۔ جو اس سے سرکشی برتے گا (تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، خواہ وہ میری اولاد میں سے ہی کیوں نہ ہو (۱۱/۴۶) البتہ اس کی حفاظت اور پرورش کا انتظام تیرے طبیعی قانون کے مطابق، اسی طرح ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں کا انتظام ہوتا ہے۔ (کیونکہ تیرا طبیعی قانون کافر و مومن سب کے لیے یکساں ہے۔ (۲/۱۲۶)

انسانوں کو گمراہ کرنے والے مٹی اور پتھر کے بت نہیں بلکہ وہ مذہبی پیشوا ہیں جو لوگوں کو غیر خدا کی معبودیت کا سبق پڑھاتے ہیں اور اس طرح خدا کی طرف جانے والے راستے کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آیت کے اگلے حصہ میں کہا کہ "میرا وہ ہے جو میرا اتباع کرے" یہ دو قومی نظریہ کی اساس و بنیاد ہے۔ "ہم میں سے وہ ہے جو ہمارا اتباع کرتا ہے"۔ نہ وہ جس کا ہم سے کوئی نسبی یا صلبی رشتہ ہے۔ (دو قومی نظریہ کے لیے دیکھیے انڈکس میں عنوانات قوم، قومیت یا دو قومی نظریہ بالخصوص مطالب الفرقان۔ جلد پنجم ص ۲۳۳) اور جلد سوم ص ۴۳ حضرت ابراہیمؑ کی ساری زندگی اسی ابدی اصول کی زندہ تفسیر ہے۔ باپ سے قطع تعلق، قوم سے قطع تعلق، گھربار سے قطع تعلق، وطن سے قطع تعلق۔ غرضیکہ ہر اس شخص یا رشتے سے قطع تعلق جو خدا کے راستے میں حائل ہو (۹/۱۱۴)۔

اس کے بعد انھوں نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا۔

(۱۴/۳۷) رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ ٱلۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجۡعَلۡ أَفۡـِٔدَةٗ مِّنَ ٱلنَّاسِ تَهۡوِيٓ إِلَيۡهِمۡ وَٱرۡزُقۡهُم مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُونَ ﴿٣٧﴾

اے ہمارے نشوونما دینے والے! میں نے (اس مقصد عظیم کے لیے) اپنی کچھ اولاد کو، تیرے واجب الاحترام گھر کے پاس لا کر بسا دیا ہے (اسے "تیرا گھر" اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ تمام انفرادی نسبتوں سے بلند ہو کر، عالمگیر انسانیت کی مشترکہ جائے امن ہے) یہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں کھیتی کا نام و نشان تک نہیں۔

میں نے یہ سب اہتمام اس لیے کیا ہے کہ میری اولاد نظام صلوٰۃ کو قائم کرے۔ یعنی اس نظام کو جس میں تمام افراد تیرے قوانین کا اتباع کریں۔ سو اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ایسا کر دے

کہ (ان تمام، بظاہر، نامساعد حالات کے باوجود) لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز، تو ان کے لیے زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق فراہم کر دے (۳۷/۱۴) تاکہ (یہ معیشت کی طرف سے مطمئن ہو کر، اس مقصد کے حصول کے لیے، ایسے جذب و انہماک سے کام کریں کہ) ان کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔

رزق کی دُعا کے متعلق مطالبُ الفرقان۔ جلد سوم (صـ۱۶) دیکھیے اور انڈکس میں "قرآن کا معاشی نظام" وہاں آیۂ زیرِ نظر بھی آگئی ہے۔

اس آیت میں دو ایک اور اہم نکات بھی آئے ہیں۔ کہا یہ ہے کہ (۱) اس شہر میں امن و امان قائم رہے۔ اور (۲) رزق کی طرف سے اُنھیں اطمینان ہو۔ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ۔ تاکہ وہ اقامتِ صلوٰۃ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس سے مراد (جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے) نماز پڑھنا ہی ہے تو اس کے لیے ان شرائط کی ضرورت نہیں۔ نماز تو ہر حال میں پڑھی جا سکتی ہے۔ بلکہ حالتِ خوف اور افلاس میں لوگ زیادہ خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ اس سے مراد نظامِ خداوندی قائم کرنا ہے (تشریح اس کی انڈکس میں صَلٰوۃ کے عنوان میں ملے گی)۔ اس نظام کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۲/۱۱۰)

اور اگلی بات یہ ہے کہ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔ ہمارے ہاں شکر کا جو مفہوم لیا جاتا ہے (یا اللہ تیرا شکر!) ظاہر ہے کہ اس کے لیے بھی اِن شرائط کی ضرورت نہیں۔ شکر کے مفہوم کے لیے (دیکھیے مطالبُ الفرقان جلد دوم۔ صـ۲۶۳) آیہ زیرِ نظر سے بھی اس مفہوم کی مزید تشریح ہوتی ہے۔ یعنی انھیں امن و سکون، خوشحالی اور فارغ البالی میسر ہو تاکہ جس بلند مقصد کے لیے وہ سرگرم ہوں، اس میں ان کی محنت بھرپور نتائج پیدا کر سکے۔ اگر نہ معاشرہ میں امن ہو نہ رزق کی طرف سے اطمینان، تو انسان کوئی کام دلجمعی سے نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کی مساعی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ سعدیؒ تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اور یہ کہ صبح میں جب نماز کے لیے کھڑا ہوا تو دل اس پریشانی میں مبتلا رہا کہ — چہ خورد بامداد فرزندم؟ — اس کے بعد عرض کیا کہ بارِ الٰہا! جو کچھ میں گزارش کر رہا ہوں یہ محض میرے دل کی آواز ہے اور تو اسے خوب جانتا ہے۔

۱۴/۳۸ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

اے ہمارے پروردگار! جو کچھ ہمارے دلوں کے اندر ہے اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں، تجھ پر سب روشن ہے (اور ایک ہم ہی پر کیا موقوف ہے) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کچھ بھی ایسا نہیں جو تجھ سے پوشیدہ ہے (اس لیے تو یہ بھی جانتا ہے کہ جس نظام کی ابتداء اس چھوٹے سے پیمانے پر ہمارے ہاتھوں کرائی جا رہی ہے، اس کا مستقبل کیا ہونے والا ہے)۔

مستقبل کے لیے جو کچھ مانگا، اس کے ساتھ ہی بارگاہِ خداوندی میں ان نوازشات کریمانہ کا شکریہ بھی ادا کیا جو ماضی میں ان کے حال پر ارزانی ہوتی تھیں۔ فرمایا:

۱۴/۳۹ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

(میں اس کے مستقبل کے متعلق بڑا پُرامید ہوں۔ اس لیے کہ یہ کچھ تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں کہ حالات کی ناسازگاری کے باوجود، تیری عنایات سے وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کی انسان کو عام طور پر، توقع نہیں ہو سکتی۔ مثلاً) تو نے مجھے، میری کبرسنی میں (جبکہ میں اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا) اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ جیسے بیٹے عطا کیے جو تیری حمد و ستائش کے زندہ پیکر ہیں۔ لہٰذا مجھے پورا پورا یقین ہے کہ میرا خدا، میری دعا کو ضرور شرفِ قبولیت عطا کرے گا۔

اور دعا وہی ہے جو پہلے مانگی تھی۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے بارِ دیگر پیشِ خدمت کر دیا۔

۱۴/۴۰ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

اس دعا کو، کہ وہ مجھے اور میری اولاد کو اس قابل بنا دے کہ ہمارے ہاتھوں نظامِ صلوٰۃ قائم ہو جائے، اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو میری اس آرزو کو ضرور پورا کر دے۔

اور اس کے ساتھ ہی

(۱۴/۴۱) رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

نیز میری یہ بھی دعا ہے کہ مجھ سے، میرے ماں باپ سے اور دوسرے مومنین سے، اگر کوئی چھوٹی موٹی کوتاہیاں ہو جائیں تو ظہورِ نتائج کے وقت ہم ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں (۹/۱۱۴)۔

باپ کے لیے دعائے مغفرت کے سلسلے میں، مطالب الفرقان، جلد ششم میں زیر آیت (۹/۱۱۴) دیکھیے۔ نیز وہ حوالے جو اُوپر مفہوم میں دیے گئے ہیں۔



جیسا کہ معلوم ہے قرآن کریم ان داستانوں کو تاریخی کوائف و حوادث کے طور پر بیان نہیں کرتا، ان سے مقصد عبرت و موعظت اور تذکیر و تنذیر ہوتی ہے۔ جس مقصد کے لیے داستانِ ابراہیمیؑ کو اس مقام پر دہرایا گیا ہے، آئندہ آیت میں یوں واضح کر دیا کہ:

(۱۴/۴۲) وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ۚ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ﴿۴۲﴾

(ان آرزوؤں اور التجاؤں کے ساتھ، ابراہیمؑ نے اس نظام کی ابتدا کی تھی جس کی تکمیل کے لیے اے رسولؐ! اب تم اٹھے ہو۔ اس لیے) تم یہ خیال نہ کرو کہ یہ ظالم اور سرکش لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، ہم اس سے بے خبر ہیں۔ (ہمارا قانونِ مکافات سب کچھ دیکھ رہا ہے) لیکن یہ وقفہ مُہلت کا ہے۔ جب ظہورِ نتائج کا وقت آجائے گا اس وقت تباہیوں کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ ان کے ڈھیلے باہر نکل آئیں گے۔

میدانِ کارزار میں شکست کھانے کے بعد ان کی حالت یہ ہو گی کہ:

(۱۴/۴۳) مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۖ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ﴿۴۳﴾

افراتفری کا یہ عالم ہو گا کہ یہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر، منہ اٹھائے، بدحواس بھاگے چلے جائیں گے۔ (سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ حتیٰ کہ) ان کی نگاہ بھی کاشانۂ چشم میں لوٹ کر نہیں آئے گی۔ ان کے دل

امید سے خالی ہو جائیں گے۔ یاس انگیز جذبات ان پر بُری طرح سے چھا جائیں گے۔
اس وقت یہ لوگ، جو اس قدر سرکشی اختیار کر رہے ہیں، یوں ذلیل و خوار ہوں گے۔

۱۴/۴۴ وَاَنۡذِرِ النَّاسَ يَوۡمَ يَاۡتِيۡهِمُ الۡعَذَابُ فَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا رَبَّنَاۤ اَخِّرۡنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيۡبٍۙ نُّجِبۡ دَعۡوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ‌ؕ اَوَلَمۡ تَكُوۡنُوۡۤا اَقۡسَمۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ زَوَالٍۙ ﴿۴۴﴾

اے رسول! تُو ان مخالفین کو تباہی کے اس قسم کے ہولناک عذاب سے آگاہ کر دے۔ اُس وقت یہ سرکش اور مستبد لوگ، خدا سے گڑگڑا کر التجا کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مہلت دیدے ہم تیری دعوت قبول کرلیں اور تیرے رسول کی پیروی کریں گے۔

ان سے کہا جائے گا کہ تم اس سے پہلے قسمیں اٹھا اٹھا کر کہا کرتے تھے کہ ہماری قوتوں کو زوال نہیں آسکتا (اب دیکھو کہ زوال کسے کہتے ہیں اور وہ کیسے آیا کرتا ہے؟)

اُنھیں یاد دلایا جائے گا کہ:

۱۴/۴۵ وَّسَكَنۡتُمۡ فِىۡ مَسٰكِنِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ وَتَبَيَّنَ لَـكُمۡ كَيۡفَ فَعَلۡنَا بِهِمۡ وَضَرَبۡنَا لَـكُمُ الۡاَمۡثَالَ ﴿۴۵﴾

تم ان لوگوں کی بستیوں میں بسے تھے جنھوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی تھی۔ ہم نے تمھیں اُن کے واقعات سے آگاہ کر دیا تھا تاکہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ ہمارا قانونِ مکافات اس قسم کے لوگوں سے کیا کیا کرتا ہے۔ نیز اور بھی طرح طرح کی مثالوں سے تم پر حقیقت واضح کر دی تھی۔

اور یہ بھی کہ:

۱۴/۴۶ وَقَدۡ مَكَرُوۡا مَكۡرَهُمۡ وَعِنۡدَ اللّٰهِ مَكۡرُهُمۡ‌ؕ وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡهُ الۡجِبَالُ ﴿۴۶﴾

ہم نے تمہیں یہ بھی بتادیا تھا کہ اُن لوگوں نے نظامِ خداوندی کی مخالفت کے لیے طرح طرح کی چالیں چلیں — ایسی چالیں کہ اُن سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں — لیکن ہمارے قانونِ مکافات کے مقابلہ میں ان کی کوئی چال کارگر نہ ہوسکی۔

اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ:

(۱۴/۴۷) فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴۷

لہٰذا، تم اس زعم میں نہ رہو کہ خدا، اپنے پیغامبروں سے (جو اس انقلاب کی دعوت لے کر آتے ہیں) وعدہ خلافی کرے گا (اس کی ہر بات پوری ہو کر رہے گی) اس لیے کہ وہ بڑی قوتوں کا مالک ہے اور اس کے قانونِ مکافات کی رُو سے، ہر غلط عمل کی سزا مل کر رہتی ہے۔ اس سے کوئی ادھر اُدھر نہیں بھاگ سکتا۔

"خدا کے انتقام" کے مفہوم کے لیے مطالب الفرقان۔ جلد چہارم ص۶۰ دیکھیے؛

اس تصادم کے بعد جو انقلاب آئے گا اُسے قرآن نے چار لفظوں میں اس جامعیت اور حُسن و خوبی سے سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ شعور اور ذوق دونوں اس پر وجد کرتے ہیں۔ فرمایا:

(۱۴/۴۸) يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۴۸

(اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میری اس دعوت سے ایسا انقلاب آئے گا کہ) یہ زمین ایک دُوسری زمین بن جائے گی۔ آسمان اور آسمان ہو جائے گا[1]۔ یہ زمین و آسمان بدل جائیں گے۔ موجودہ معاشرہ کی

---

[1] اگر ان الفاظ سے (مجازی نہیں بلکہ) حقیقی معانی لیے جائیں تو اس سے مفہوم وہ کائناتی (طبیعی) انقلاب ہوگا جو کسی وقت آئے گا۔ اس کی کنہ وحقیقت کے متعلق ہم قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سے مراد وہ انقلاب ہے جو نبیٔ اکرمؐ کے ہاتھوں، اس معاشرہ میں رُونما ہُوا اور جس نے سب کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس اعتبار سے ہم نے ان الفاظ کے مجازی معنی لیے ہیں۔

کی جگہ ایک نیا معاشرہ وجود میں آجائے گا اور تمام لوگ اس خدا کے سامنے اُبھر اور نکھر کر آجائیں گے جس کے قانون کے سامنے اور کسی کا قانون نہیں چل سکتا، اور جو بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔

معاشرہ میں ممکن انقلاب کا نقشہ کس جامعیت سے کھینچا گیا ہے۔ یعنی اس سے باطل کے سابقہ نظام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ یہ تو حصہ لَآ ہوگا۔ اس کی جگہ حق کا نظام نو متمکن ہو جائے گا۔ یہ حصہ اِلَّا ہوگا ۔ خاک با خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے ۔ دوسرے مقامات پر (انبیاء سابقہ کے سلسلہ میں) کہا تھا۔ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ۔ (۱۱/۸۲ ؛ ۱۵/۷۴) " اسے تہ و بالا کر دیا گیا تھا" لیکن حضورؐ خاتم النبیینؐ کے ہاتھوں جو انقلاب آیا، اس سے" یہ زمین بدل گئی، آسمان بدل گیا" آپ دُنیا کے غیر مسلم مؤرخین سے پوچھئے ۔ وہ بھی بتائیں گے کہ اس انقلاب کی رُو سے زمین اور آسمان کس طرح بدل گئے تھے ۔ یہ پیوندسازی نہیں تھی، تعمیرِ نو تھی ۔ تجدید نہیں تھی، تاسیس تھی ۔ قرآن انقلاب کی دوسرے معاشرہ سے مفاہمت یا مصالحت نہیں کرتا، وہ اُسے جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر اس کی جگہ یکسر نیا معاشرہ قائم کرتا ہے ۔ لَآ اِلٰـهَ کی رُو سے تو ہر نظامِ کہن کی بنیادی اینٹوں تک کو اُکھیڑ پھینکنا ہوتا ہے ۔

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند ‌ ؛ ‌ اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

یہی قرآن کے انقلاب اوّلیں کے وقت ہُوا تھا ۔ یہی اُس قوم کو کرنا ہوگا جو بار دگر قرآنی انقلاب برپا کرنے کا تہیہ کرے ۔

اقبالؒ کے الفاظ میں :

یا بکُش در سینۂ من آرزوئے انقلاب ‌ ‌ ‌ یا دگرگوں کُن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں

یا چُناں کُن یا چُنیں !

(زبورِ عجم ـ صفحہ ۳۵)

اس سے بھی آگے :

کافرا دلِ آوارہ دگر بارہ باو بند ‌ ‌ ‌ برخویش کشادیدہ و از غیر فرو بند

دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز

باطل معاشرہ میں اصلاحِ احوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی اصلاح نہیں ہوتی ، اس کا استیصال ہوتا ہے۔ جبھی تو اس کی جگہ ایک نیا معاشرہ قائم ہوتا ہے ۔ جو لوگ باطل معاشرہ کو اصلاحات کی

رُو سے "اسلامی" بنانے کی سعیٔ لاحاصل کرتے ہیں، اُن کی کوششیں کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

اس انقلاب کی رُو سے، سابقہ زمین کی جگہ نئی زمین آجائے گی اور سابقہ آسمان کی جگہ نیا آسمان۔ وہ زمین جو ربوبیتِ خداوندی کے نور سے جگمگا اُٹھے گی:

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ (۳۹/۶۹)

۱۴/۴۹—۵۰ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

اُس دن، تو ان مجرمین کو دیکھے گا (جو اس وقت یوں سرکشی اختیار کر رہے ہیں) کہ یہ (جنگی قیدیوں کی شکل میں) زنجیروں میں جکڑے جا رہے ہوں گے۔

ان کی زرہیں، جو انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے پہنی تھیں، تارکول کی طرح ان کے جسم سے چمٹ کر، ان کے لیے وبالِ جان بن رہی ہوں گی۔ ان کے چہرے، جنگ کی آگ سے جُھلسے ہوئے ہوں گے۔

یہ کچھ ظلم و استبداد کی رُو سے نہیں ہو گا (جیسا کہ دنیاوی انقلابات میں ہوتا ہے) یہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہو گا۔

۱۴/۵۱ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

یہ سب اس لیے ہو گا کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ مل جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس کا قانون، اعمال کا محاسبہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتا۔ وہ بہت تیز واقع ہوا ہے۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد کہا:

۱۴/۵۲ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا

هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

یہ تمام حقائق اور واقعات اس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ :

۱۔ ان کی روشنی میں انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔

۲۔ لوگ آگاہ ہوجائیں کہ غلط روشِ زندگی کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوتا ہے۔

۳۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ کائنات میں اقتدار اور اختیار صرف خدا کا ہے کسی اور کا نہیں — اور

۴۔ صاحبانِ عقل و بصیرت ان حقیقتوں کو سامنے رکھیں جنھیں عام طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اور ان سے عبرت حاصل کریں۔

مفہوم پوری پوری تشریح کر رہا ہے۔ اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

اختتام — سورۂ ابراھیم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

چودھواں پارہ ——————— پندرہویں سورۃ



باب چہارم

سُورۃ الحِجر

قرآنی اِنقلاب آیا ہی چاہتا ہے

○ قرآنی انقلاب آیا ہی چاہتا ہے جس کے بعد انکار کرنے والے حسرت میں رہیں گے۔
○ تباہ ہونے والی اقوام حیوانی سطح زندگی پر جی رہی ہوتی ہیں، تاہم ان کی تباہی سے پہلے انہیں مہلت کا وقفہ ملتا ہے۔
○ قرآن کی حفاظت کا ذمّہ اس کے نازل کرنے والے نے لے رکھا ہے۔
○ ماضی میں بھی ہدایتِ خداوندی لانے والے رسُولوں کا استہزاء کیا گیا۔
○ قرآن آجانے کے بعد علم و یقین کا ایک چمکتا ہوا شعلہ ہر قیاس و تخمین کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔
○ ارض و سمٰوٰت میں ہر جگہ نظامِ ربوبیّت کارفرما ہے۔
○ زندگی اور موت خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔
○ سامانِ زیست بھی قوانینِ خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے۔
○ کشمکشِ حیات میں عرُوج، خدا کے عطا فرمودہ صراطِ مستقیم پر چلنے سے حاصل ہوتا ہے ـــ اس اصُول کی وضاحت کے لیے قصۂ ابلیس و آدم کی مثال۔

○ قانونِ مکافاتِ عمل کی نتیجہ خیزی سے بچنا ممکن نہیں۔
○ قوموں کا عروج و زوال اور استخلاف و استبدال بھی اسی قانون کے تابع ہے۔
○ حضرت ابراہیمؑ اور قومِ لُوطؑ کی مثالیں۔
○ قومِ لُوطؑ جنسی بدنہادی کے سبب تباہ ہُوئی۔
○ 'اصحاب الایکہ' حدُود فراموشی اور 'اصحاب الحِجر' قوانینِ خداوندی سے اعراض کے سبب اپنی ہستی کھو بیٹھے۔
○ اُن کی تباہ شدہ بستیوں کے آثار ان کی تباہی کی مُنہ بولتی تصاویر ہیں۔
○ اقوامِ سابقہ کی تاریخ اور قرآن کے حقائق اس بات پر دلیل ہیں کہ قرآنی انقلاب برپا ہو کے رہے گا۔
○ اگرچہ ابتداء میں لوگ ساتھ نہیں دیتے اور قرآنی حقائق کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔
○ داعیٔ انقلاب کو صبر و استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہنے کی تلقینِ خداوندی۔

باب چہارم

سُوْرَةُ الْحِجْرِ

پندرھویں سُورۃ

اَصْحَابُ الْحِجْرِ کے الفاظ اس سورۃ کی آیت (۸۰/۱۵) میں آئے ہیں۔ اسی سے اس کا نام اَلْحِجْر ہے۔ یہ قومِ ثمود کا دارالخلافہ تھا جس کا تفصیلی تذکرہ مطالبُ الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۲۸۹-۲۶۵) میں آچکا ہے۔ نیز جلد ششم (سُورۃ الاعراف میں۔ اس داستان کے جو کوائف پہلے آچکے ہیں، ان کے حوالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔ تشریح ان نکات کی، کی جائے گی جو اس میں پہلی بار آئیں گے۔ سورۃ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱/۱۵) الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ اُس ضابطۂ خداوندی یعنی قرآن کریم کی آیات ہیں جو اپنے مطالب کو بڑے واضح انداز میں بیان کرتا ہے۔

قرآنِ کریم کو بیشتر مقامات میں کِتابِ مُبِین کہا گیا ہے۔ یعنی خود بھی واضح اور ہر متعلقہ بات کو واضح طور پر بیان کرنے والی۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن اپنے مطالب آپ واضح کرتا ہے۔

اس سورۃ کی اس پہلی آیت سے سابقہ پارہ (۱۳) ختم ہوجاتا ہے اور اگلی آیت سے چودھواں پارہ شروع ہوتا ہے۔



چودھواں پارہ

۱۵/۲ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ۞۲

(اے رسول! اب یہ انقلاب اپنے فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ رہا ہے۔ اس کے بعد) یہ لوگ، جو اس کی اس طرح مخالفت کر رہے ہیں، اس حسرت میں رہیں گے کہ اے کاش! ہم بھی اسے تسلیم کر لیتے۔

قرآنی تعلیم کا اساسی نکتہ یہ ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش شروع سے چلی آ رہی ہے۔ اس کشمکش میں حق کی علمبردار جماعت کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن آخرالامر حق غالب آتا ہے اور باطل ناکام رہ جاتا ہے۔ اس میں البتہ مہلت کا وقفہ ہوتا ہے جس میں باطل کے پرستار اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ فتح و کامرانی انہی کے حصے میں آئے گی۔ لیکن اس وقفہ کے ختم ہو جانے پر وہ خاسر و نامراد رہ جاتے ہیں اور اس وقت انہیں اس کا افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے شروع ہی سے اس حقیقت کا اندازہ کیوں نہ لگا لیا اور حق کی مخالفت کر کے خواہ مخواہ اس قدر نقصان اُٹھایا۔

۱۵/۳ ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۞۳

(اس وقت) تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے، کہ یہ زندگی کی حیوانی سطح پر (۴۷/۱۲) کھائیں، پئیں اور سامانِ زیست سے فائدہ اٹھائیں (اس لئے کہ، ان کے نزدیک زندگی کا مقصد ہی یہ ہے۔ یہ انہی مشاغل میں اُلجھے رہیں اور اس طرح) ان کی لمبی چوڑی آرزوئیں (۴/۱۲۰) انہیں زندگی کے بلند مقاصد سے، غافل رکھیں۔ وہ وقت دُور نہیں کہ انہیں اپنی اس غلط روش کے انجام کا علم ہو جائے گا۔ (ابھی مُہلت کا وقفہ ہے)

قرآنِ حکیم دو نظریات، دو ذہنیتوں، دو مسالک اور ان کی بنیادوں پر انسانوں کے دو گروہوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی، اس کے جسم کی طبیعی زندگی ہے جسے طبیعی قوانین کے تابع بسر کیا جاتا ہے۔ کھایا، پیا، افزائش نسل کی، اور موت آنے پر مر گئے۔ یہ حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ جسے کفر کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (۴۷/۱۲)۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اس کے جسم کی زندگی ہی نہیں،

جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے اس کی ذات (نفس) کہا جاتا ہے۔ انسانی جسم کی پرورش اور نشوونما طبیعی قوانین کے تابع ہوتی ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما قوانینِ خداوندی (ابدی اقدارِ الٰہیہ) کی رُو سے ہوتی ہے۔ انسانی اعمال کے نقوش اس کی ذات پر مُرتّب ہوتے رہتے ہیں۔ موت سے انسان کا جسم تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی ذات آگے بھی جاتی ہے۔ اسے اُخروی زندگی کہا جاتا ہے۔ حق و باطل کی کشمکش درحقیقت انہی دو نظریاتِ حیات کی کشمکش ہے۔ اقوامِ سابقہ کی داستانیں (جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں)، اس کے اسی دعویٰ کی شہادت ہیں۔ فرمایا:

۱۵/۴ وَمَآ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۴﴾

اور (ان سے پہلے بھی) ہم نے کسی قوم کو، ان کی مہلت کا وقفہ پورا ہونے سے پہلے تباہ نہیں کیا۔
یہ وقفہ، ہمارے قانونِ مکافات کے مُطابق متعیّن ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں (۱۳/۳۸)۔

مُہلت کا وقفہ، قوموں کے اعمال، یعنی اُن کی زندہ رہنے کی صلاحیّت کی نسبت سے متعیّن ہوتا ہے لیکن وہ (دیگر قوانینِ خداوندی کی طرح) ہوتا ایسا اٹل ہے کہ اس میں ذرا کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ سُورۃ الاعراف ... کی آیت (۷ : ۳۴) اور سُورۃ الرّعد کی آیت (۱۳ : ۳۸) میں اس نکتہ کی وضاحت کی جا چکی ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ:

۱۵/۵ مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ﴿۵﴾

ہمارا یہ قانونِ مہلت اس قدر اٹل ہے کہ نہ کوئی قوم اس وقفہ سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے بعد زندہ رہ سکتی ہے۔ (غلط روش کے نتائج ٹھیک اپنے وقت پر ظہور میں آتے ہیں)۔

لیکن مُہلت کے وقفہ میں یہ بات کسی قوم کی سمجھ میں بمشکل آ سکتی ہے کہ اس کی روش اور نظام کا نتیجہ تباہی ہو گا۔ جب ایک قوم، قوّت و شوکت اور دولت و حشمت کے اوجِ کمال پر ہو، اس سے کہنا کہ وہ تباہ ہو جائے گی، اس کے لیے ناقابلِ فہم ہو گا۔ ایسا کہنے والے کے متعلق وہ اس کے سوا اور کیا کہے گی کہ وہ پاگل ہے۔ سابقہ اقوام میں سے ہر قوم نے ایسا ہی کیا۔ یہی کچھ حضور نبی اکرمؐ کے ساتھ ہوا۔ آپؐ نے جب اپنی قومِ مخاطب سے کہا کہ —— تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ —— تو:

۱۵/۶ وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶

(اس وقت یہ لوگ خوابِ غفلت میں پڑے ہیں اور اُن کے نشۂ قوت کی بدمستی کا یہ عالم ہے کہ)

یہ کہتے ہیں کہ "اے وہ، جس پر یہ قرآن نازل ہو رہا ہے، تو پاگل ہے۔"

جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے، ہر رسُول کے متعلق یہی کہا گیا۔ (دیکھیے: ۲۶/۲۷؛ ۳۷/۳۶؛ ۴۴/۱۴؛ ۵۱/۳۹؛ ۵۱/۵۲)۔ سورۃ (۵۱/۵۲) میں جامع طور پر بتایا گیا کہ ہر رسُول کے ساتھ یہی ماجرا گزرا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں خود خدا نے اس الزام کی تردید کر دی۔ (۵۲/۲۹؛ ۶۸/۲-۵۱؛ ۸۱/۲۲)

اور پھر وہی مُطالبہ کہ اگر تم خدا کے رسُول ہو تو معجزہ دکھاؤ۔

۱۵/۷ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷

"اور اگر تو اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئے۔"

معجزہ کے مطالبہ کے سلسلہ میں، انڈکس میں "معجزات" کا عنوان دیکھیے۔ جہاں تک ملائکہ کا تعلق ہے، مطالبُ الفرقان۔ جلد دوم (صفحہ ۶۶) پر بتایا جا چکا ہے کہ ان سے مراد وہ قوتیں ہیں جو مُدبّراتِ امُورِ الٰہیہ اور مؤثراتِ قوانینِ خداوندی ہیں۔ ہم اُن کی کنہ وحقیقت کے متعلق تو کچھ نہیں جان سکتے البتہ قرآنِ حکیم نے ان کے مناصب اور فرائض کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح تدبیر امُور کرتے اور قوانینِ خداوندی کو مؤثر بناتے ہیں۔ اس مقام پر سلسلۂ کلام یُوں چلا آ رہا ہے کہ اس (قومِ مخالف) کی غلط روشِ زندگی کا نتیجہ ان کی تباہی ہوگی جو مہلت کا وقفہ گزر جانے کے بعد وارد ہوگی۔ اس تباہی کے وارد ہونے کو ملائکہ کی طرف منسُوب کیا گیا۔

۱۵/۸ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝۸

(اے کاش! ان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی کہ) ہم ملائکہ کو یونہی نازل نہیں کیا کرتے۔ وہ اُس وقت نازل ہُوا کرتے ہیں جب نتائج کے حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آنے کا وقت آجائے۔ (وہی حق و باطل کی کشمکش کا آخری مرحلہ ہوتا ہے)، اس کے بعد پھر کسی کو مہلت نہیں ملا کرتی۔

اس موضوع کا تسلسل تو آگے بھی برقرار رہے گا لیکن درمیان میں ایک ایسی بات کہہ دی جس کا بڑا گہرا تعلق قرآن کے ہر دعویٰ کے ساتھ ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہر قوم کے نظامِ حیات کا انجام ان قوانین کے

مطابق ہوتا ہے جو اس کتاب میں مذکور ہیں۔ چونکہ قرآن ایک مستقل ابدی ضابطۂ حیات ہے اس لیے اس کے متعلق یہ وضاحت ضروری تھی کہ یہ مکمل اور غیر متبدل ہے۔ اس میں نہ کسی حک و اضافہ کی ضرورت ہوگی، نہ کسی قسم کے تغیر و تبدل کی۔ اس حقیقت کو (۶/۱۱۵) میں واضح کر دیا۔ ایک ابدی ضابطۂ حیات کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔ اس کا اعلان اگلی آیت میں کر دیا:

۱۵/۹ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٩﴾

اس قرآن کو ہم نے نازل کیا ہے (اس لیے اس کا ہر وعدہ سچا ہو کر رہے گا۔ اور چونکہ اسے تمام نوعِ انسان کے لیے، ہمیشہ کے لیے، ضابطۂ ہدایت بن کر رہنا ہے، اس لیے ہر طرح سے اسے مکمل کر دیا گیا ہے۔ اس میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ۶/۱۱۵) اس لیے ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکے گی۔

یہ تینوں خصوصیات (مکمل، غیر متبدل اور محفوظ) قرآن کے ساتھ مختص ہیں۔ مذاہبِ عالم میں سے کسی مذہب کی مبینہ آسمانی کتاب میں اس کا دعویٰ نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی مذہب کا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ جس کتاب کو وہ (اپنی) الہامی کتاب کہتے ہیں وہ وہی ہے جو ان کے بانیٔ مذہب نے انہیں دی تھی۔ (تفصیل اس کی میری کتاب — مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی — میں ملے گی)۔ ان کے برعکس قرآن کے اس دعویٰ کو کہ وہ غیر محرّف اور محفوظ ہے، غیر مسلموں تک تسلیم کرتے ہیں۔ یہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے نبی اکرمؐ نے یہ کہہ کر اُمّت (بلکہ عالمِ انسانیت) کو دیا کہ یہ ان پر بذریعہ وحی (خدا کی طرف سے) نازل ہوا ہے۔ یہ قرآن کی منفرد خصوصیت ہے اور ختمِ نبوّت کی ایک محکم دلیل یہ بھی ہے۔ جب ایک منزل من اللہ کتاب اپنی مکمل اور غیر محرّف شکل میں موجود ہو، اور اس میں نہ کسی اضافہ کی ضرورت ہو، نہ تبدیلی کی، تو کسی رسول کے آنے کی ضرورت کہاں رہتی ہے۔ (تفصیل ان امور کی مطالبُ الفرقان کی سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔)

اس کے بعد پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

۱۵/۱۰-۱۱ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٠﴾ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١١﴾

(اور تم کوئی نئے رسول نہیں ہو) ہم نے، تم سے پہلے بھی، مختلف گروہوں کی طرف رسول بھیجے

تھے۔ لیکن جو رسول بھی آیا، لوگوں نے اس سے (اسی طرح) مذاق کیا (جس طرح یہ تم سے مذاق کرتے ہیں۔ لہٰذا تمھارے لیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں)

آیت (۱۵/۶) میں کہا تھا کہ انبیاء کو مجنون کہا گیا۔ یہاں کہا ہے کہ ان کا (معاذ اللہ) مذاق اُڑایا گیا (مثلاً ۱۵/۱۱) مخالفت میں یہ حرکت انتہائی ذلیل اور کمینہ ہوتی ہے لیکن قوت کا نشہ ہر جوہر انسانیت اور ہر رمقِ شرافت کو سلب کرلیتا ہے۔ اس لیے قرآن نے کہا کہ یہ کسی خاص مجرم یا مجرم قوم کے ساتھ مختص نہیں ہیں۔ یہ تمام مجرمین کی مشترکہ نفسیاتی کیفیت ہے۔

۱۵/۱۲ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾

یہ سب مجرمین کی مشترکہ نفسیاتی کیفیت ہے (کہ وہ اپنی قوت کے نشہ میں، دلائل و براہین کا جواب استہزا اور استخفاف سے دیتے ہیں)۔

اس نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ تھا کہ نہ اقوامِ سابقہ کے مجرمین پیغاماتِ خداوندی پر ایمان لاتے تھے اور نہ ہی نبیٔ اکرمؐ کی قومِ مخالف، قرآن پر ایمان لائے گی۔ ایمان کے لیے مقدّم شرط نفسیاتی تبدیلی ہوتی ہے۔

۱۵/۱۳ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾

یہی کیفیت تمھاری قوم کی ہے۔ یہ بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے (اور جو کچھ پہلے لوگ کرتے رہے وہی کچھ یہ بھی کریں گے۔)

باقی رہا ان کا معجزات کا مُطالبہ، سو واقعہ یہ ہے کہ جس ذہنیت کے یہ حامل ہیں اُس کی رُو سے یہ کوئی خارقِ عادت واقعہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

۱۵/۱۴-۱۵ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

(یہ کہتے ہیں کہ اگر تو اپنے دعوٰیٔ رسالت میں سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتے لے آ۔ یہ ان کی محض کٹ حجتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ) اگر ہم ان کے سامنے، آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ اُس میں چڑھنے بھی لگ جائیں (تو بھی یہ ایمان نہ لائیں)۔ اُس وقت یہ کہنے لگ جائیں کہ ہماری نگاہ

بند کر دی گئی ہے یا ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔ (ایمان لانے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن پر غور و فکر کیا جائے، نہ یہ کہ اس قسم کی خارقِ عادات باتوں کا تقاضا کیا جائے)۔

(انڈکس میں معجزات کا عنوان دیکھیے)

(۰)

شعورِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں مظاہرِ فطرت کی کنہ و حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ وہ اُن کے جلال سے اس قدر مرعوب اور اُن کے جمال سے ایسا مسحور ہوا کہ انہیں اپنا معبود بنا لیا اور ان کی پرستش شروع کر دی۔ اس کی ان تمام توہم پرستیوں میں سب سے زیادہ تباہ کُن عقیدہ یہ تھا کہ ہر ایک انسان کا ایک ستارہ ہے جس کے ساتھ اس کی قسمت وابستہ ہے۔ یہ عقیدہ اس لیے تباہ کُن تھا کہ اس سے انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی بجائے مجبور و مقہور ہو جاتا ہے۔ جب انسان کی تقدیر کسی موہوم قوت (ستارہ) کے تابع ہو، اس سے زیادہ مجبور اور کون ہو گا؟ پجاریوں کی موج تھی۔ ہر معبد (پرستش گاہ) میں نجومی براجمان رہتے تھے جن کے گرد قسمت کا حال پوچھنے والوں (بالخصوص پوچھنے والیوں) کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ یہ کہہ کر کہ وہ عالمِ افلاک میں جا کر بزمِ ستارگان کی تمام کیفیت معلوم کر کے آتے ہیں، ان توہمات کی گرہیں مضبوط کرتے رہتے تھے۔ قرآن آیا اور اس نے ہر قسم کی توہم پرستی کی تاریکی کو علم و بصیرت کی روشنی میں بدل دیا۔ اُس نے مظاہرِ فطرت اور اجرامِ فلکی کی اصل و حقیقت کو بے نقاب کر کے کاہنوں اور منجموں کی دسیسہ کاریوں کے پردے چاک کر دیئے (انڈکس میں فطرت کا عنوان دیکھیے) اس نے ستاروں کے متعلق کہا:

۱۵ / ۱۶—۱۷ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنَاهَا مِن كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿١٧﴾

(باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ اس قسم کی باتیں جو قرآن میں بیان ہوتی ہیں، ان کو کاہن اور نجومی علم النجوم — ستاروں کے علم — کی رُو سے بھی بتا سکتے ہیں تو ستاروں کی کیفیت یہ ہے کہ) ہم نے فضا کی بلندیوں میں، اُبھرے ہوئے کُرّے پھیلا رکھے ہیں اور اُن سے روشنی منعکس ہوتی ہے تو دیکھنے والوں کو بڑے خوشنما نظر آتے ہیں۔ اور انہیں ہم نے ہر قسم کی تخریبی قوتوں سے محفوظ رکھا ہے (اسی لیے تو یہ عظیم کارگہِ کائنات، اس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ یہ ہے ستاروں

کی حقیقت جن کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ان کی گردش سے انسانی مقدرات اور واقعات کے متعلق پیش گوئیاں کی جاسکتی ہیں۔)

اور کاہنوں اور منجّموں کے متعلق کہا کہ ان کے یہ فریب دورِ جہالت میں تو چل جاتے تھے، اب (نزولِ قرآن سے) علم کی روشنی پھیل رہی ہے۔ اب ان کی دکانیں بند ہوجائیں گی۔ اُس نے اپنے مخصوص تشبیہی انداز میں کہا:

[۱۵/۱۸] اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

(ان پیش گوئیوں کی بھی اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں کہ یہ) محض ان کی قیاس آرائیاں ہیں۔ (یہ قیاس آرائیاں اُس زمانے میں تو چل سکتی تھیں جب علم کی روشنی اس قدر عام نہ تھی۔ اب قرآن کے بعد، ان کا دور ختم ہوگیا) اب ہر قیاس و تخمین کے پیچھے علم و یقین کا ایک چمکتا ہُوا شُعلہ موجود ہے جو اُس کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

(۲۶/۲۱۰-۲۱۲ ; ۳۷/۸-۹ ; ۵۲/۳۸ ; ۷۶/۵ ; ۷۲/۸-۹)

قرآنِ کریم کی اس نظری تعلیم کی عملی تشریح حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ نے کر دی۔ یہ عقیدہ عام تھا کہ جب کسی عظیم انسان (سردارِ قوم) کی وفات ہوتی ہے تو چاند اور سُورج کو گہن لگتا ہے۔ حضورؐ کے ایک صاحبزادے کی وفات صِغرسنی میں ہوئی تو اتفاق سے اس دن سُورج کو گرہن لگ گیا۔ لوگوں میں یہ مشہور ہوگیا کہ ایسا آپؐ کے بیٹے کی وفات کی وجہ سے ہُوا ہے۔ آپ کو معلوم ہُوا تو فرمایا کہ چاند یا سورج کو گہن قوانینِ خداوندی کے مُطابق لگتا ہے۔ اس کا کسی کی موت یا حیات سے کوئی تعلق نہیں (بخاری۔ کتابُ الکسوف) یوں حضورؐ نے اس توہم پرستی کی جڑ کاٹ دی۔

آگے بڑھنے سے پہلے، ایک ثانیہ کے لیے رُکیے اور سوچئے کہ قرآن نے ان توہمات کے بُتوں کو کس طرح توڑا تھا اور ہم (مسلمانوں) نے ـــــ ان بتوں کے پاشیدہ ٹکڑوں کو اپنی مزرکاہِ عقیدت سے اُٹھا کر کیسے جوڑا اور اپنے "اسلامی عقاید" کے محرابوں میں سجایا۔ اس نے نجوم (ستاروں کے ساتھ انسانی قسمت کی وابستگی) کو توہّم پرستی اور منجّموں کو باطل پرست قرار دیا تھا۔ ہم نے اسی نجوم کو حقیقی علم اور اس کی بنا پر پیش گوئیوں اور تقدیر کو اپنا عقیدہ بنالیا جس سے انسان مجبورِ محض بن کر رہ گیا (انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھیے) ہمارے دور میں علامہ اقبالؒ نے۔ تقدیر (جبر) کے باطل عقیدوں کی تردید میں بڑی کثرت سے لکھا ہے اور ہر اُس عقیدہ یا

نظریہ کو جس سے انسان کے صاحبِ اختیار ہونے پر کسی نوع سے بھی حرف آتا ہو، باعثِ تذلیلِ انسانیت قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ حیوان' اپنی جبلّت کی رُو سے مجبور ہوتا ہے انسان صاحبِ اختیار ہوتا ہے ؎

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات   انسان فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

وہ احکامِ الٰہی کی پابندی اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے۔ اس نے انسان سے کہا کہ تمھیں خالقِ فطرت نے آزادی عطا کی ہے کہ اپنی تقدیر آپ مرتّب کر و۔

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ   خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اُس نے نجوم کی رُو سے قسمت دریافت کرنے والوں کے متعلق کہا ؎

ستارہ کیا تری تقدیر کی خبر دیگا   وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبُوں

اور منجّموں کے متعلق کہا :

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے   کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

لیکن قرآن کچھ کہے اور اقبالؒ بیچارہ کتنا ہی چلاّئے، اس ملوکیّت زدہ اُمّت کو عقیدۂ جبر ہی راس آتا ہے" جو کچھ ہو رہا ہے سب اللہ کی طرف سے ہے، ہم اسے بدل ہی نہیں سکتے۔"

نہ آسماں بگردش و ما در میانہ ایم   غالب دگر مپرس کہ برما چہ می رَوَد

قرآن' انسان کو جن بلندیوں پر پہنچاتا ہے اُس کے متعلق تو پوچھنا ہی کیا، جو دانشور اپنی بصیرت کی رُو سے مقامِ انسانیت کا کچھ اندازہ کر لیتے ہیں، انھیں بھی اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ "مقدّرات کے ستاروں" کی حقیقت کیا ہے۔ نیٹشے ایک جگہ کہتا ہے :

میں اس مقام پر کھڑا ہوں جہاں سے میں اپنے مقدّر کے ستاروں کو جُھک کر دیکھتا ہوں۔

اور ایک مردِ مومن پکار اُٹھتا ہے کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است   اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

وہ تھی قرآن کی تعلیم کا ماحصل — شرف و تکریمِ انسانیت — اور یہ ہے ہمارا مسلک !



آیت (۱۵/۱۸) میں اس نے ستاروں اور ستارہ شناسوں کی حقیقت کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دھرتی (زمین) کو ماتا (دیوی) اور پہاڑوں کو دیوتا ماننے والوں سے کہا کہ جنھیں تم اپنا معبود سمجھ رہے ہو اُن کی اصل و حقیقت یہ ہے کہ:

۱۵/۱۹ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾

درحقیقت یہ ہے کہ یہ فضا اور اس میں تیرنے والے کُرّے، سب ہمارے نظامِ ربوبیّت کے کل پُرزے ہیں۔ بلندیوں کی طرف وہ کُرّے اور پستی کی طرف) زمین کا کُرہ، جسے (گول ہونے کے باوجود) ہم نے پھیلا رکھا ہے اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ بنا دیے ہیں (جن سے دیگر فوائد کے علاوہ، زمین کی آب پاشی کے لیے واٹر ورکس کا کام لیا جاتا ہے۔ اس پانی کے ذریعے) ہم نے زمین میں نہایت عمدہ توازن اور تناسب سے، تمام چیزیں اُگائیں۔



جیسا کہ ہم (مسلسل) واضح طور پر کہتے چلے آرہے ہیں، کہ قرآن نہ تاریخ کی کتاب ہے (جس وجہ سے وہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرتا ہے)۔ نہ علومِ سائنس کی کتاب (جس کے لیے وہ تخلیقِ کائنات، تخلیقِ انسان، علومِ فطرت، علمُ الافلاک، علمُ الارض، نباتات، جمادات وغیرہ سے متعلق علوم و فنون کا اس شرح و بسط سے ذکر کرتا ہے)، اُس کے سامنے ایک بنیادی مقصد ہے اور یہ تمام علوم، انسان کو اس مقصد کی طرف لے جانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وہ اس لیے ان کا ذکر کرتا ہے۔ آیاتِ زیرِ نظر میں اس نے اجرامِ فلکی، زمین، پہاڑ، مقاماتِ رُکیّتہ کا ذکر کرنے کے بعد کہا:

۱۵/۲۰ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ ﴿۲۰﴾

اور زمین کی اس پیداوار کو، تمہارے لیے وجۂ معاش (روزی کا سامان) بنایا۔ تمہارے لیے بھی اور اُس مخلوق کے لیے بھی جن کے لیے تم رزق مہیا نہیں کرتے۔

غور کیجئے۔ قرآنِ کریم نے نظامِ ربوبیّت کی وُسعتوں کو کس طرح چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ زمین (اور اُس کے مزروعات) مخلوق کے لیے ذرائع رزق ہیں۔ اس لیے کسی کو حق حاصل نہیں کہ اسے اپنی جائیداد

بنا کر بیٹھ جائے (انڈکس میں عنوان زمین دیکھیے) پھر کہا۔ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ۔ ضمیر کُمْ میں تمام انسان آجاتے ہیں۔ لہٰذا ان ذرائع رزق کا نظم و نسق اس انداز سے ہونا چاہیے کہ تمام انسانوں (لَكُمْ) کے لیے اس سے رزق مہیا ہو۔ اگر کسی انتظام میں کوئی ایک انسان بھی سامانِ زیست (رزق۔ معاش) سے محروم رہ جائے تو یہ منشائے خداوندی کے خلاف ہوگا۔ (انڈکس میں دیکھیے' قرآن کا معاشی نظام)

پھر یہ سامانِ زیست اِنسانوں تک محدود نہیں، اس میں تمام ذی حیات آجاتے ہیں (وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرٰزِقِيْنَ)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذرائع رزق کی وسعتیں محدود ہیں اور مخلوق بکثرت۔ پھر یہ مخلوق پھیلتی ہی جاتی ہے تو اس صورت میں یہ ذرائع اس مقصد کو کس طرح پورا کرسکیں گے؟ کہا کہ:

۱۵/۲۱ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

ہمارے پاس (کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں) ان چیزوں کے بے بہا ذخیرے ہیں (جو تمہارے لیے سامانِ زیست بنتی ہیں)، لیکن ہم انھیں ایک معیّنہ اندازے کے مطابق باہر لاتے ہیں (اس معیّنہ اندازے کا دوسرا نام قانونِ فطرت ہے)۔

خالقِ فطرت کے اس انتظام پر غور کیجیے۔ خشک زمین، کُرہ ارض کا قریباً پانچواں حصّہ ہے۔ جب سے اس پر ذی حیات کی نمود ہوئی ہے، یہ ان سب کو رزق بہم پہنچاتی جاتی ہے۔ اس میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت (لامحدود نہیں تو) بے کنار ہے۔ اس میں سے رزق کی پیداوار قوانینِ فطرت کے مُطابق ایک خاص اندازے کے مُطابق ہوتی ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ یہ اپنے خزانے ایک ہی بار اُگل دیتا تو آنے والی نسلیں بھُوکی مرجاتیں۔ علاوہ ازیں استحصالی قوتیں زمین پر قابض ہو کر اس میں سے رزق نکال لے گئیں اور یہ سارے کا سارا رزق ان کے حوالے کر دیتی تو بقایا مخلوقِ خدا کا جو حشر ہوتا، ظاہر ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ انھیں بھی رزق حاصل کرنے کے لیے ہر بار جدّوجُہد کرنا پڑتی ہے۔

"بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ" میں بھی ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ زراعت کے لیے بھی قوانین مقرر ہیں۔ ان قوانین کا علم جس قدر بڑھتا جائے گا (وہ بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ہوتا جائے گا) اس نسبت سے ارضی خزائن کی زیادہ نمود ہوتی جائے گی۔ سو سال پہلے اور موجودہ دور کی ارضی پیداوار میں کس قدر فرق ہے وہ انہی قوانین کے "معلوم"

ہونے (اور ان پر عمل کرنے) کا نتیجہ ہے۔ جو قومیں اس علم کو زیادہ سے زیادہ جس قدر حاصل کریں گی اور ان کے مطابق زراعت کریں گی، ان کے ہاں اسی قدر رزق کی ارزانی ہوگی۔

ذرائع رزق تنہا زمین تک محدود نہیں۔ اس کے ساتھ دیگر عناصر بھی تعاون کرتے ہیں جن کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے۔

۱۵/۲۲ وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ ﴿۲۲﴾

اس مقصد کے لیے، ہم ہوائیں چلاتے ہیں جو پانی کے بخارات سے لدی ہوتی ہیں (برعکس آندھیوں کے۔ ۵۱/۴۱) پھر ہم انہی بادلوں سے مینہ برساتے ہیں اور اس کا پانی تمہارے پینے کے کام آتا ہے۔

(یہ ذخائر ہمارے پاس رہتے ہیں، تمہارے پاس نہیں رہتے۔

اس کے بعد پھر ان نکات کی اہمیت واضح کر دی جن کے لیے ان تصریحات کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ افراد کی موت وحیات اور اقوام کا عروج وزوال ان ہی ذرائع کے ساتھ وابستہ ہے اور دوسرے یہ کہ ان کے خالق بھی ہم ہیں اور مالک بھی ہم حقیقی مالک، خالق ہی ہو سکتا ہے۔ فرمایا:

۱۵/۲۳ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ﴿۲۳﴾

اور (ہر شئے کو ہمارے قانون کے مطابق) زندگی ملتی ہے اور اسی کے مطابق موت طاری ہوتی ہے۔

(ان تصریحات سے واضح ہے کہ کائنات میں جس قدر سامانِ زلیست ہے، اُس کے) مالک ہم ہیں۔

(تم مالک نہیں ہو کہ اسے سمیٹ کر بیٹھ جاؤ (۵۶/۶۳ — ۷۴)

سورۃ قٓ میں بھی ایک آیت انہی الفاظ پر مشتمل ہے۔ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ (۵۰/۴۳)

ہم تو اس قسم کی آیات سے یونہی سرسری طور پر آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن جن اہلِ علم حضرات کی نگاہیں گہرائیوں تک پہنچتی ہیں، وہ ان کے اسلوبِ بیان کو بھی قرآن کا معجزہ سمجھتے ہیں۔ (H.A.R. GIBB) عربی زبان کا سکالر اور ممتاز مستشرق ہے۔ اس نے ایک، بقامت کہتر لیکن بقیمت بہتر کتاب لکھی ہے (MODERN TREND IN ISLAM) اس میں اُس نے اس نکتہ پر بحث کی ہے کہ قرآنِ کریم کا دنیا کی کسی زبان میں ترجمہ

نہیں ہوسکتا۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے :

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو نہیں سکتا ـــ جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کی بجائے، مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وُسعت اور جامعیت کو مقیّد کر دیں گے۔ ایسی آیات میں، جن میں عام واقعات یا قوانین و احکام مذکور ہوں، ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو، لیکن، بایں ہمہ، جو مدّ و جذر، جو نشیب و فراز، جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش۔ اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے، وہ ترجمہ میں کیا آسکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجئے۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ اِلَیْنَا الْمَصِیْرُ ۵۰:۴۳

اور انگریزی ہی نہیں، دُنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھا دیجئے۔ اس کے چھ الفاظ میں جو پانچ مرتبہ "ہم" (WE) کی تکرار ہے، اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی؟ (صفحہ ۴ ترجمہ رواں)

یہ ہے قرآن مجید کی پانچ پانچ، چھ چھ الفاظ پر مشتمل آیات کا اعجازِ بیان۔ (میں نے اسی لیے قرآنِ کریم کے ترجمہ کی بجائے اس کا مفہوم مرتّب کیا ہے)۔ یہ حقیقت ہے کہ ترجمہ (خواہ کسی زبان میں ہو) قرآن کا مفہوم ادا کر ہی نہیں سکتا۔ کوئی اور زبان تو ایک طرف، خود عربی زبان کے مرادف الفاظ بھی قرآنی الفاظ کا مفہوم ادا نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں ایک مشہور تفسیر ہے ـــ جلالین ـــ اس میں قرآنی الفاظ کے مرادف الفاظ ساتھ کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ آپ کسی آیت کے قرآنی الفاظ کو دیکھیے اور اس کے بعد اُس کے مُرادف الفاظ کی رُو سے اس آیت کے "اصلی اور نقلی" کا فرق نکھر کر سامنے آجائے گا۔ میں نے اس موضوع پر، مفہوم القرآن، جلد اوّل کے شروع میں "تعارف" کے تحت تفصیلی بحث کی ہے۔

اس ضمنی بحث کے بعد آگے بڑھیے۔ یہ کہنے کے بعد کہ سامانِ زیست، جس کے ساتھ افراد اور اقوام کی موت و حیات وابستہ ہے، قوانینِ خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے۔ فرمایا:

۱۵/۲۴ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ۲۴

اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کون (اپنی ہنرمندیوں اور چابک دستیوں کی بنا پر) آگے بڑھ جانے

والے (اور اس طرح سامانِ معیشت اپنے قبضے میں لے لینے والے) ہیں اور کون پیچھے رہ جانے والے ہیں۔
رزق سے متعلق جو موضوع پیچھے سے چلا آرہا ہے ہم نے مفہوم اس کی رعایت سے متعین کیا ہے۔ لیکن اس آیت میں ایک عظیم اصول بیان کیا گیا ہے جو حصولِ رزق تک محدود نہیں۔ وہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ خدا نے انسان کو غلط اور صحیح راستے دکھا دیے۔ اُسے یہ صلاحیت عطا کر دی کہ وہ جونسا راستہ چاہے اختیار کرے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس کی استعداد بھی مرحمت فرما دی کہ وہ اس (شاہراہِ حیات) پر جس رفتار سے جی چاہے چلے، جس قدر عمل کوشش ہونا چاہے ہو۔ شاہراہِ حیات افراد اور اقوام کے لیے دوڑ (RACE) کا میدان ہے۔ جو آگے نکلنا چاہے آگے نکل جائے جو پیچھے رہنا چاہے پیچھے رہ جائے۔ جو جس قدر کوشش کریگا اس کے مطابق اُس کا مقام معین ہوگا۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔ (۱۷/۲۰) ہم نہ کسی کے راستہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کریں گے نہ بند لگائیں گے۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ جو آگے بڑھ جائے، آگے بڑھ جائے۔ جو پیچھے رہنا چاہے، پیچھے رہ جائے۔
لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ؕ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۷۴/۳۷-۳۸)
اس کی رفتار کی تیزی اور سستی اُس کے عمل کی رُو سے متعین ہوگی۔ اس کی پابندی اور آزادی کے حلقے اس کی حرکت کے مطابق وضع ہوں گے۔ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳/۲۶) مسابقت اور منافست کی یہ آماجگاہ سب کے لیے ممکن ہے۔ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (۵۶/۱۰-۱۱)۔ جو جتنا آگے بڑھ جائے گا، اُتنا ہی (یوں سمجھو کہ) "خدا کے قریب" ہوتا جائے گا۔

دوسروں سے آگے بڑھنے کا جذبہ انسان کے اندر ہے۔ خدا اس جذبہ کو افسردہ نہیں کرتا، اسے اُبھارتا ہے۔ اس کی تحقیر نہیں کرتا، تحسین کرتا ہے۔ آگے بڑھنے والوں کو شاباش دیتا ہے، ان میں انعامات تقسیم کرتا ہے لیکن وہ آگے بڑھنے کے میدان میں تفریق اور تمیز کرتا ہے اور یہ تفریق و تمیز، نظریۂ حیات کی رُو سے متعین ہوتی ہے۔
ایک نظریۂ حیات یہ ہے کہ زندگی بس اس دُنیا کی زندگی ہے اور مقصودِ حیات اس دنیا کی آسائشوں اور ستائشوں کو حاصل کرنا ہے خواہ وہ کسی طرح سے حاصل ہو جائیں۔ اس سے کوئی بلند مقصد ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ اسے مادی نظریۂ حیات یا سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن اسے کفر کہہ کر پکارتا ہے۔ ایک دوسرا

سے آگے بڑھنے کا جذبہ اس میدان میں بھی، اس حد تک شدید کہ اس دوڑ میں انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم اسے تکاثر سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ، انسان کو زندگی کے حقیقی مقصد سے غافل کر دیتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱۰۲/۱)

اس کا جذبۂ محرکہ ہوس ہوتی ہے۔ انسانی ضروریات کی تو ایک حد ہوتی ہے، لیکن ہوس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اسے تو جس قدر پورا کیا جائے، اتنی ہی یہ اور بڑھ جاتی ہے۔ اس میدان میں انسان ساری عمر دوڑتا رہتا ہے — ہانپتا، کانپتا — تاآنکہ وہ قبر کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲)

ایک یہ میدان ہے۔ اس کے مقابل دوسرا میدان ہے جس کے متعلق کہا کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (۵/۴۸) آگے بڑھنا ہے تو نوعِ انسان کی بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ (قرآن کریم میں متعدد مقامات میں عملِ خیرات میں آگے بڑھنے کی ترغیب و تلقین آئی ہے۔ (مثلاً ۲/۱۴۸؛ ۳/۱۱۳؛ ۲۳/۶۱؛ ۳۵/۳۲)

اِن مقامات سے زیرِ نظر آیت (۱۵/۲۴) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ۝

ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ اس پر زور دیتا ہے کہ قرآن کریم کی صحیح تفسیر احادیث کی رُو سے ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تفسیر خود رسُول اللہ کی بیان فرمودہ ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن کی جو تفسیر خود رسُول اللہ نے بیان فرمائی ہو اس سے بہتر تفسیر اور کونسی ہو سکتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جن تفسیری روایات کو رسُول اللہ کی طرف منسُوب کیا جاتا ہے اُن میں بیشتر ایسی ہیں جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتی ہیں کہ ان کی نسبت رسُول اللہ کی طرف صحیح نہیں، وہ وضعی ہیں۔ اسی آیت (۱۵/۲۴) کی قرآن کی رُو سے تفسیر آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب دیکھئے کہ حدیث اس کی تفسیر کیا بیان کرتی ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ:

> ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسُول اللہ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اُسے نہ دیکھ سکیں لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے کی طرف سے اُسے جھانکتے رہتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی۔

یہ تفسیر کسی تبصرہ کی محتاج نہیں بجز اس کے کہ جن لوگوں نے اس قسم کی روایات وضع کی تھیں، اُن پر تو کیا افسوس ہو سکتا ہے، افسوس آتا ہے ہمارے علمائے کرام پر جو بضد ہیں کہ اسے صحیح روایت مانو اور جو اسے یہ

کہہ کر صحیح ماننے سے انکار کر دے کہ اس کا جذبۂ ایمان اس قسم کی روایات کو رسول اللہ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تو اسے منکرِ حدیث قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیتے ہیں!

اس سے اگلی آیت میں ہے:

۱۵/۲۵ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۲۵

(لیکن ہمارا نظامِ ربوبیت اس قسم کی تفریق و تقسیم کی اجازت نہیں دے سکتا) ہم ان سب کو یک جا اکٹھا کر دیں گے اور یہ ہمارے اس قانون کی رُو سے ہو گا جو سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

اگر آیت (۱۵/۲۳) میں موت اور حیات، طبعی زندگی سے متعلق سمجھیں تو اگلی آیت (۱۵/۲۴) کا مفہوم یہ ہو گا کہ جو لوگ دنیا سے پہلے جا چکے ہیں وہ بھی خدا کے علم میں ہیں اور جو ہنوز پیچھے ہیں انہیں بھی خدا جانتا ہے۔ اس اعتبار سے آیت ۱۵/۲۵ میں يَحْشُرُهُمْ کا تعلق اُخروی زندگی سے ہو گا۔ لیکن اگر ان آیات کا تعلق رزق میں مسابقت سے ہو گا تو زیرِ نظر آیت (۱۵/۲۵) کا مفہوم یہ ہو گا کہ مستقدمین اور مستاخرین سے جو طبقاتی تقسیم پیدا ہو گئی ہے، جب نظامِ ربوبیت قائم ہو گا تو یہ باقی نہیں رہے گا۔ تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔

اس کے بعد توجہ کا رُخ قصۂ ابلیس و آدم کی طرف منعطف کرایا۔ جو اس کشمکش کی داستان ہے۔ لیکن اس سے پہلے دو ایک آیات میں تخلیقِ انسانی کا ذکر اشارۃً کر دیا جس سے (ضمناً) ان اسرائیلی افسانوں کی (بار دِگر) تردید مقصود ہے جن کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ آدم ایک مٹی کا پُتلا تھا۔ اس سے انسانوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ فرمایا:

۱۵/۲۶ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۲۶

یہی وہ حقیقت ہے جسے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں، پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے اور جسے اب پھر دُہرایا جاتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ انسان کی پیدائش کی ابتدا سیاہ کیچڑ سے ہوئی جو سوکھ کر کھنکھنانے لگتا ہے۔ (یعنی وہ طینِ لازب جس سے زندگی کا اوّلین جرثومہ وجود میں آیا۔ ۳۷/۱۱)

تخلیقِ انسانی کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد اوّل (صفحہ ۲۹) اور (زیادہ تفصیل کے ساتھ) جلد دوم (ص ۳ تا آخر) لکھا جا چکا ہے۔ (مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ حوالہ کے طور پر ذیل کی آیات میں اس کا اجمالی و تفصیلی ذکر آیا ہے۔

۶/۲ ؛ ۱۵/۲۸ ؛ ۱۵/۳۱ ؛ ۱۶/۴ ؛ ۱۸/۳۷ ؛ ۱۹/۶۷ ؛ ۲۲/۵ ؛ ۲۳/۱۲ ؛ ۲۵/۵۹ ؛ ۳۲/۷ ؛ ۳۶/۷۷ ؛ ۳۷/۱۱ ؛ ۳۸/۷۱ ؛ ۴۰/۶۷
۷۶/۱-۲ ؛ ۷۷/۳۰ ؛ ۸۶/۵ ؛ ۹۶/۲

اِن آیات کے مطالعہ سے یہ پوری سرگزشت بیک نگاہ سامنے آجائے گی۔ اس کے ساتھ اگر انڈکس میں ارتقاء کا عنوان بھی دیکھ لیا جائے تو زندگی جن مراحل سے گزر کر پیکرِ انسانی تک پہنچی ہے وہ بھی واشگاف ہو جائیں گے۔ اور "نفس" کے عنوان کے تحت وہ امتیازی خصوصیت جس نے انسان کو دیگر مخلوق سے ممتاز کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان سے پہلی مخلوق کا اجمالی سا ذکر ہے جسے جِنّ کہہ کر پکارا گیا۔

۱۵/۲۷ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

واضح رہے کہ انسانی تخلیق سے پہلے کرۂ ارض میں بے پناہ حرارت تھی۔ اس لیے ابتداءً یہاں ایسی مخلوق کی نمود ہوئی جس میں حرارت برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔

اس کی تشریح مطالب الفرقان۔ جلد دوم (صفحہ ۶۵ پر) آچکی ہے۔

اس کے بعد آیات ۲۸ تا ۴۲ میں قصۂ ابلیس و آدم کو دہرایا گیا ہے۔ تخلیقِ آدم۔ ابلیس۔ ملائکہ کشمکش ابلیس و آدم۔ یہ تمام موضوعات شرح و بسط کے ساتھ مطالب الفرقان۔ جلد دوم کے ابتدائی ابواب میں آچکے ہیں۔ اور زیرِ نظر آیات بھی جستہ جستہ وہاں مذکور ہیں۔ اس لیے یہاں ان آیات کا صرف مفہوم بیان کیا جائے گا بجز کسی ایسے نکتہ کے جو پہلے نہ آچکا ہو۔ اگر آپ جلد دوم کے پہلے دو ابواب کا ایک بار پھر مطالعہ فرمالیں تو زیرِ نظر آیات خود بخود سمجھ میں آتی جائیں گی۔ سورۃ الاعراف کی آیات (۷/۱۱-۱۸) میں بھی یہی موضوع بیان ہوا ہے مطالب الفرقان جلد پنجم۔ صفحات ۱۷۰-۱۷۲ میں ان کی تشریح کے لیے یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔

۱۵/۲۸ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

اور جب تیرے نشوونما دینے والے نے کائناتی قوتوں سے کہا کہ میں سیاہ کیچڑ کی کھنکھنی مٹی سے انسان کی تخلیق کی ابتداء کرنے والا ہوں۔

آدم کا اختصاص۔

۱۵/۲۹ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

سوجب ایسا ہو کہ وہ زندگی کی مختلف ارتقائی منازل طے کر کے، اس مقام تک پہنچ جائے جہاں اس میں ٹھیک ٹھیک تناسب اور توازن قائم ہو جائے، اور میں، اس میں، اپنی توانائی کا ایک شمّہ ڈال دوں اور یوں وہ صاحبِ اختیار وارادہ، انسانی ذات کا حامل بشر بن جائے، تو تم اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا۔

نفخِ روح" اہم موضوع ہے جس کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم (صـ۱۴۱) پر آچکی ہے۔

۱۵/۳۰—۳۱ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

چنانچہ اس پروگرام کے مطابق، تمام کائناتی قوتیں اس کے سامنے جھک گئیں۔ (یعنی انسان میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکے)، لیکن اس کے اپنے سرکش جذبات اس کے سامنے نہ جھکے۔ اُنھوں نے اس سے انکار کر دیا اور سرکشی اختیار کر لی۔ (۲/۳۴)

ابلیس سے پوچھا گیا کہ اُس نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔

۱۵/۳۲ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾

خُدا نے ابلیس (انسان کے سرکش جذبات) سے پوچھا کہ تم اس کے سامنے جھکنے والوں میں سے کیوں نہیں ہوئے؟ تم نے سرکشی کیوں اختیار کی؟

اُس نے جواب دیا:

۱۵/۳۳ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

اُس نے کہا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایک ایسی مخلوق کے سامنے جھک جاؤں جسے سیاہ کیچڑ کی کھنکتی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے (یعنی انسان کی مادی تخلیق ایسی ہے کہ اس کے سرکش جذبات اس پر

غالب رہتے ہیں لیکن اسے جو "خدائی توانائی کی جھلک ۔ انسانی ذات ۔ دے دی گئی ہے اس سے یہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ اس کے جذبات اس پر غالب نہ آئیں)۔

یہاں تو اتنا ہی کہا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ؕ (۷/۱۲)

ہم نے اُس سے پُوچھا کہ جب ہم نے تجھے، آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو وہ کونسی بات تھی جس نے تمہیں اس حکم کی تعمیل سے باز رکھا؟

اُس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہُوں۔ تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔ (آبِ گِل کے پیکر انسان پر اُس کے تند و تیز جذبات غالب رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے اندر، وحی کے اتباع سے شرفِ انسانیت کو بیدار کر لیتا ہے، تو پھر وہ ان جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ (۱۵/۴۰-۴۲)

یہ جواب منطقی ہے۔ لیکن اُس نے عقلی دلیل کی رُو سے جواب دیا ہے (یہ الگ بات ہے کہ وہ دلیل باطل تھی۔ لیکن جواب بہرحال منطق پر مبنی تھا)۔ اہلِ فقہ کے ہاں قیاس (منطقی طریق) بھی قانونی ماخذ میں سے ہے۔ (فقہ میں قانونی ماخذ چار ہیں۔ یعنی قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع)۔ اہلِ حدیث کا مسلک یہ ہے کہ شریعت میں عقل کو دخل نہیں۔ اس لیے وہ عقلی طریق (قیاس) کو ماخذِ قانون نہیں مانتے۔ وہ اس کے سخت خلاف ہیں۔ اس کے لیے وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ" اول من قاس ابلیس "سب سے پہلے جس نے قیاس (عقلی دلیل) سے کام لیا تھا، وہ ابلیس تھا اور اس کی سند یہی آیت ہے۔ جو لوگ قرآن پر مبنی دین کے متعلق یہ کہیں کہ اس میں عقل کو دخل نہیں (حالانکہ سارا قرآن عقل و بصیرت کی تاکید سے بھرا پڑا ہے) ان کے متعلق کیا کہا جائے کہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا (۲/۲۶) اکثر لوگ اپنی گمرہی کی سند بھی قرآن سے دیتے ہیں!

اس کے اس مسلک کا نتیجہ یہ ہے کہ:

(۱۵/۳۴-۳۵) قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾

خدا نے کہا کہ تو اس حالت سے نکل جا۔ تو ہر قسم کی سعادت سے محروم ہو گیا۔ (اگر انسان اپنے جذبات سے

مغلوب ہو جائے، اور انہیں قوانینِ خداوندی کے تابع نہ رکھے، تو وہ، زندگی کی سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے) — اور یہ محرومی انسان کے ساتھ مسلسل لگی رہتی ہے۔ اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

اُس نے کہا:

[۱۵/۳۶—۳۸] قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾

اس نے کہا کہ مجھے انسان کی نشاۃِ ثانیہ تک مہلت دے دی جائے۔ اُس دَور تک کہ انسان کی ترقی کے راستے میں جس قدر موانع ہیں، یہ انہیں دُور کر کے، صحیح انسانی آزادی حاصل کرے۔ جب انسان ان تمام موانع کو دُور کر کے، وحی الٰہی کے مطابق، صحیح آزادی حاصل کرے گا تو اُس وقت اُس پر، اس کے تخریبی جذبات غالب نہیں آسکیں گے۔ (۶ / ۱۵-۱۴)

خدا نے کہا ہاں! تجھے اس وقت تک مہلت دی جاتی ہے۔ یعنی ایک وقتِ معلوم تک کے لیے ("وقتِ معلوم" اس لیے کہ انسان کی صحیح آزادی کا دور، جس میں وہ اپنے پست جذبات پر غلبہ حاصل کرلے، ایسا نہیں جس کا کسی کو علم ہی نہ ہو سکے۔ یہ کوئی رازِ درونِ پردہ نہیں — اس کا ہر ایک کو علم ہوگا — اور ہوتا ہے)

اُس نے کہا:

[۱۵/۳۹] قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۳۹﴾

اس نے کہا کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے جو، اس طرح، زندگی کی سعادتوں سے محروم کر دیا اور مجھ پر خوشگواریوں کی راہ مسدود کر دی ہے تو میں بھی اب ایسا کروں گا کہ انسانوں کو اُن کی طبعی زندگی کے مفاد و اسباب اس طرح خوشنما بنا کر دکھاؤں کہ وہ انہی میں اُلجھ کر رہ جائیں اور انسانی زندگی کے بلند مقاصد کو یکسر نظرانداز کر دیں (اور یوں میری طرح، یہ بھی زندگی کی حقیقی سعادتوں سے محروم رہ جائیں۔)

یہ وہ آیت ہے جس میں انسانی زندگی اور دین کے اہم بنیادی حقائق پوشیدہ ہیں۔ اس کے لیے مطالب الفرقان

جلد دوم، صفحہ ۱۰۱-۱۰۰ کو بار دیگر ضرور دیکھ لیجیے۔ اسے تو بار بار دیکھنا چاہیئے۔ آپ اس اصول پر غور کیجیے کہ جو شخص اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنی ذمہ داری کو دوسروں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے، اُس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ دُنیا میں جس قدر فتنہ و فساد برپا ہوتے ہیں (وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی) اُن کی بُنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ غلط کوش یا غلطکار اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا، اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا، اُسے دوسروں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسے قبول نہیں کرتا، جھگڑا شروع ہو جاتا ہے اور اس کے جو نتائج برپا ہوتے ہیں، ظاہر ہیں۔ اگر انسان اپنی غلطی کو تسلیم اور اپنی ذمہ داری کو قبول کر لے تو اس قسم کے جھگڑے ہی پیدا نہ ہوں اور انسان کی اصلاح بھی بآسانی ہو جائے۔ تقدیر کا عقیدۂ جبر اسی قسم کی ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ میں اپنی غلطی کا ذمہ دار نہیں۔ "میں تو مجبور محض ہوں"۔ اس ذہنیت کی وجہ سے انسان دین اور دُنیا دونوں میں تباہ ہوتا ہے۔ (انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھئے)۔

ابلیس نے جب یہ کہا کہ: وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ میں ان سب (تمام لوگوں) کو گمراہ کروں گا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ:

[۱۵ ؍ ۴۰] إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿۴۰﴾

ہاں! جو تیرے مخلص بندے ہوں گے، ان پر میرا زور نہیں چل سکے گا۔ (وہ اپنے آپ کو وحی کے تابع رکھیں گے اس لیے سرکش جذبات ان پر غالب نہیں آ سکیں گے)۔

دوسرے مقام پر (۱۷ ؍ ۶۵) بھی یہی آیا ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس سے انسان ہر قسم کے شر کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی استثناء سے، ان تمام باطل عقاید اور مسالک کی تردید ہو جاتی ہے جن کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے گناہوں کے داغ دھو ہی نہیں سکتا (تفصیل کے لیے مطالب الفرقان۔ جلد دوم، عنوان ابلیس ص ۴۲ تا ۵۰) یہی حق پر مبنی مسلک ہے۔

[۱۵ ؍ ۴۱] قَالَ هَٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ﴿۴۱﴾

خدا نے کہا۔ جس راہ پر مخلص بندے چلیں گے، وہی وہ توازن بدوش راہ ہے جو انہیں سیدھی، زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی۔ یہی راہ میری طرف لانے والی ہے۔ (۱۶ ؍ ۹)

پہلے ابلیس نے خُدا سے کہا تھا کہ تیرے مخلص بندوں پر میرا کوئی اختیار و اقتدار نہیں ہوگا۔ اس کے بعد خود

خدا نے اس کی یہ کہہ کر توثیق کر دی کہ:

۱۵/۴۲ اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ ﴿۴۲﴾

میرے ان بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ تیرا غلبہ انہی پر ہو سکے گا جو اس متوازن راہ کو چھوڑ کر تیرے پیچھے لگ جائیں گے۔ ان کا انجام تباہی ہوگا۔

۱۵/۴۳ وَ اِنَّ جَہَنَّمَ لَمَوۡعِدُہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۴۳﴾

یقیناً ان سب کے لیے تباہی و بربادی کا جہنم ہے اور یہ وہاں پہنچ کر رہیں گے۔

وہ جہنم:

۱۵/۴۴ لَہَا سَبۡعَۃُ اَبۡوَابٍ ؕ لِکُلِّ بَابٍ مِّنۡہُمۡ جُزۡءٌ مَّقۡسُوۡمٌ ﴿۴۴﴾

تباہی تو سب کے لیے ایک جیسی ہوگی لیکن اس تک پہنچنے کے راستے مختلف ہوں گے۔ ان میں سے ہر گروہ کا الگ راستہ ہوگا جہاں سے تباہی کے جہنم میں داخل ہوگا۔ (یعنی صراطِ مستقیم جو جنّت تک لے جاتی ہے ایک ہی ہے لیکن جب اُسے چھوڑ دیا جائے تو غلط راستے بے شمار ہوتے ہیں اور مختلف لوگ مختلف راستوں سے تباہی تک پہنچ جاتے ہیں۔ ٹھیک نشانے کا مقام ایک ہی ہوتا ہے، غلط نشانے کے مقامات لاتعداد ہو سکتے ہیں۔ ٹھیک جواب ایک ہی ہوتا ہے۔ غلط جوابات کا شمار نہیں ہو سکتا۔ خدا کا دین ایک ہی ہے۔ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب بے شمار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دین میں فرقے نہیں ہو سکتے۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

ان کے برعکس:

۱۵/۴۵—۴۶ اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۴۵﴾ اُدۡخُلُوۡہَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیۡنَ ﴿۴۶﴾

ان کے برعکس متقین (زندگی کی تباہیوں سے بچ کر قوانینِ خداوندی کے مُطابق چلنے والوں) کی منزل

سرسبز و شاداب باغات اور جاری چشمے ہوں گے۔ اس جنّتی معاشرہ میں (جو اس زندگی سے اُخروی زندگی تک مسلسل چلا جائے گا) وہ ہر تباہی سے مامون ہوں گے اور ان کی تمام صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی جائے گی۔

اس معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوگی کہ:

۱۵/۴۷ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٧﴾

اس معاشرہ کے افراد کے دلوں میں (ایک دوسرے کی طرف سے جس قدر) گرہیں ہوں گی سب صاف ہو جائیں گی — بغض، کینہ، عداوت، فریب کی کوئی بات نہیں رہے گی۔ حتیٰ کہ کوئی راز ایسا نہیں ہوگا، جسے وہ ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھیں (۲۷/۲۴)۔ وہ بھائیوں کی طرح دل کھول کر، ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔

غِلّ کی تشریح مطالب الفرقان، جلد پنجم (ص۱۹۷) پر دی گئی ہے۔ اسے دیکھ لیجئے۔ کیونکہ یہ جنّتی معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

۱۵/۴۸ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُم مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿٤٨﴾

وہاں انھیں، مشقت، تکان یا واماندگی چھو تک نہیں سکے گی۔ وہ ہر وقت تر و تازہ اور ہشاش بشاش رہیں گے۔ نہ ہی وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

یہ کچھ بیان کرنے کے بعد کہا:

۱۵/۴۹-۵۰ نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٤٩﴾ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿٥٠﴾

(اے رسول!) میرے بندوں کو یہ خبر سنا دو کہ میرے ہاں ان کے لیے ہر قسم کی حفاظت اور نشوونما کا سامان ہے۔ لیکن جو لوگ میرے قوانین کی خلاف ورزی کر کے، اپنے لیے سامانِ ہلاکت خرید لیں گے، ان کے لیے بڑی ہی الم انگیز تباہیاں ہوں گی۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ یہ عذاب قومِ لُوطؑ پر کس طرح آیا. اس سے (ضمناً) یہ بھی واضح ہے کہ (اُخروی عذاب تو اپنے مقام پر رہا) یہ عذاب اس دُنیا میں وارد ہوجاتا ہے (انڈکس میں قوم یا اقوام کا عنوان دیکھئے. متعلقہ مقامات سے واضح ہوجائے گا کہ قوموں کا عرُوج و زوال اور ان کا استخلاف و استبدال اِنہی قوانینِ مکافاتِ عمل سے وابستہ ہے)

قومِ لُوطؑ کا تعارف مطالبُ الفُرقان. جلد پنجم. (صفحہ ۲۹۰ پر) کرایا گیا ہے. اور اس کی داستان ($\frac{11}{77-83}$) میں صـ۲۹۳ تک پھیلی ہوئی ہے. علاوہ ازیں، سُورہ ہُودؑ کی آیات ($\frac{11}{77-83}$) میں بھی یہ داستان مذکور ہے (جس کے لیے مطالبُ الفرقان. جلد ششم دیکھیے).

اس داستان کا آغاز ضیفِ ابراہیمیؑ (حضرت ابراہیمؑ کے ہاں آنے والے مہمانوں) سے ہوتا ہے. مطالب جلد پنجم صـ$\frac{295}{306}$ پر تو اس کا ذکر اجمالی سا ہے. تفصیلی تذکرہ سُورۂ ہُود میں آیا ہے. چونکہ سابقہ جلدوں (پنجم اور ششم) میں یہ واقعات تفصیل سے بیان ہوچکے ہیں، اس لیے زیرِ نظر اوراق میں (حسبِ سابق) متعلقہ آیات اور ان کے مفہوم پر اکتفا کیا جائے گا، بجز کسی ایک نکتے کی تشریح کے جو پہلے نہ آیا ہو. زیرِ نظر سورۃ میں آغازِ داستان یُوں ہوتا ہے.

$\frac{15}{51}$ وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿٥١﴾

المناک تباہی کا یہ عذاب کس طرح آیا کرتا ہے، اس کے لیے انہیں (مثلاً) قومِ لُوطؑ کی تباہی کا قصہ سناؤ جس کی ابتداء ابراہیمؑ کے ہاں آنے والے مہمانوں سے ہوتی ہے. ($\frac{11}{69}$)

اس کے بعد کی پانچ آیتوں میں بیٹے کی بشارت کا تذکرہ ہے.

$\frac{15}{52-56}$ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿٥٢﴾ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿٥٣﴾ قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ﴿٥٤﴾ قَالُوا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِينَ ﴿٥٥﴾ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ

مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

وہ جب ابراہیمؑ کے ہاں آئے تو اُنھوں نے کہا کہ ہم تمہاری سلامتی کے خواہاں ہیں۔ اس نے کہا کہ تم اجنبی لوگ ہو اس لیے) مجھے تم سے کچھ اندیشہ سا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اندیشہ اور خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ ہم تمھیں ایک ایسے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو صاحبِ علم ہوگا۔ اس نے کہا کہ تم مجھے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہو حالانکہ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ تم مجھے اولاد کی خوشخبری دیتے ہو تو کن قرائن کی رُو سے؟ اب میرے ہاں اولاد کی کیا اُمید ہوسکتی ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ ہم تمھیں بالکل سچی خوشخبری دیتے ہیں۔ تم نااُمید مت ہو۔ ابراہیمؑ نے کہا نہیں! میں خدا کی رحمت سے نااُمید نہیں ہوں۔ اُس سے تو وہی نااُمید ہوتے ہیں جو اُس کا راستہ چھوڑ کر غلط راستوں پر چل نکلیں یا جنھیں صحیح راستہ نہ مل سکے۔ جو اُس کی راہ پر چلیں، ان کے سامنے اُس کی رحمت کے عالمگیر نقشے ہوتے ہیں۔ لہٰذا، میں اُس کی رحمت سے کیسے نااُمید ہوسکتا ہوں؟ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ عام قرائن کے لحاظ سے میرے ہاں اب اولاد کی اُمید نہیں ہوسکتی۔

اس خوشخبری کا ذکر سورہ ہُود کی آیات (۱۱/۶۹-۷۳) میں آچکا ہے۔ نیز مطالبُ الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۳۰۶) پر۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اُن سے پُوچھا کہ وہ کس مشن کے لیے آئے ہیں۔

۱۵/۵۷-۶۰ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

پھر اُس نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ تم جو بھیجے ہوئے آئے ہو، تو وہ کون سی مہم ہے جس کے لیے تم مامور ہو؟ اُنھوں نے کہا کہ ہم ایک مُجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں یعنی قومِ لُوطؑ کی طرف۔ وہ ساری قوم تباہ ہو جائے گی، بجُز لُوطؑ کی اپنی جماعت کے لوگوں کے۔ اُنھیں بچالیا جائے گا حتیٰ کہ لُوطؑ کے اپنے گھرانے کے لوگوں میں سے۔ اس کی بیوی بھی تباہ ہو جائے گی۔ اُس کے متعلق ہمارا اندازہ ہے کہ وہ لُوطؑ کے ساتھ نہیں جائے گی، قومِ مخالف کے ساتھ پیچھے رہ جائے گی۔

اس کا ذکر مطالب الفرقان۔ جلد پنجم (صفحہ ۲۹۵) پر آچکا ہے۔ نیز سورۃ ہُود کی آیات (۱۱ : ۷۴-۷۶) میں۔ ازاں بعد قومِ لُوطؑ کی داستان بیان ہوئی ہے جو مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۲۹۶ سے آخر تک) اور سورہ ہود کی آیات (۱۱ : ۷۷-۸۳) میں۔ زیرِ نظر سورۃ میں یہ واقعات اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

(۱۵ : ۶۱ — ۶۴) فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَاٰتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾

پھر جب وہ پیغامبر، قومِ لُوطؑ کے پاس آئے تو لُوطؑ نے اُن سے کہا کہ تم لوگ یہاں کے رہنے والے نہیں اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم یہاں کے رہنے والے نہیں لیکن ہم وہ بات لے کر آئے ہیں جس کی بابت یہ لوگ تم سے جھگڑتے رہتے ہیں۔ (یعنی وہ تباہی جس سے تم انہیں آگیا کرتے ہو، اور یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو اُسے لا کر دکھاؤ) ہم اس تباہی کو ایک ٹھوس حقیقت بنا کر ان کے سامنے لانے کے لیے آئے ہیں۔ ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ ایسا ہو کر رہے گا۔

اس کے ساتھ ہی وہاں سے ہجرت کر جانے کی بھی تلقین کر دی۔

(۱۵ : ۶۵ — ۶۶) فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

سو تم اپنی جماعت کو لے کر، کچھ رات گئے یہاں سے نکل جاؤ۔ آگے آگے انہیں جانے دو اور ان کے پیچھے پیچھے خود چلو (کہ خطرہ کے وقت، امام۔ لیڈر کو سب کے بعد جانا چاہیے) اور یہاں سے یوں دامن فشاں اُٹھو کہ پھر اس طرف مُڑ کر بھی نہ دیکھو (۱۱ : ۸۱) اور جس مقام کا تمہیں (خدا کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔ اور ہم نے لُوطؑ کو بذریعہ وحی بتا دیا کہ صبح ہوتے ہی اس قوم کی جڑیں کٹ جائیں گی بستی کے لوگوں کو اس کا علم ہُوا تو :

(۱۵/۶۷) وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾

ادہر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر جب بستی کے لوگوں کو ان نو واردوں کی اطلاع ملی تو وہ خوشیاں مناتے ہوئے آپہنچے۔ لُوطؑ نے ان سے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں تم اِن سے کوئی نازیبا حرکت کر کے مجھے رسوانہ کرو۔ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری تذلیل کا باعث نہ بنو۔ اُنہوں نے لُوطؑ سے کہا کہ کیا ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم دوسری قوموں کے لوگوں کو اپنے ہاں نہ ٹھہرایا کرو؟ (اب اگر تم وہی کچھ کرو جس سے ہم نے تمہیں روکا تھا تو اس کا خمیازہ بھگتو) اس پر لُوطؑ نے ان سے کہا کہ (اگر کوئی اجنبی مرد ادھر آنکلے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ تم اس پر پل پڑو!) یہ تمہاری عورتیں جو میرے لیے بمنزلہ میری اپنی بیٹیوں کے ہیں، موجود ہیں۔ (اپنی نفسانی خواہش کو ان سے پورا کرو)۔

اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۳۰۵) میں اور سورۃ ھُودؑ آیات (۱۱/۷۸-۱۹۰) میں کی جا چکی ہے۔ اگلی آیت کے دو معانی ہو سکتے ہیں۔ آیت ہے۔

(۱۵/۷۲) لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾

ترجمہ اس کا ہے ــ تیری جان کی قسم! وہ لوگ اپنی بدمستی میں اندھے ہو رہے تھے۔

اگر اسے انہی مہمانوں کا قول سمجھا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ وہ حضرت لُوطؑ سے کہہ رہے تھے کہ آپ کن لوگوں سے بے فائدہ مغز ماری کر رہے ہیں۔ وہ اپنے جنسی جذبات کی شدت سے اندھے ہو رہے ہیں۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ آپ ان سے کیا کہہ رہے ہیں۔ جو شخص نشہ سے بدمست ہو رہا ہو اُس پر پند و نصائح کیا اثر کر سکتے ہیں

اور اگر اسے جملہ معترضہ لیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ داستان بیان کرتے کرتے اللہ تعالیٰ نے رسُولؐ اللہ سے کہا کہ "تیری جانِ عزیز[1] کی قسم! وہ لوگ اپنے جذبات کی شدت سے اندھے ہو رہے تھے اس لیے وہ (حضرت) لُوطؑ

---

[1] "تیرے دین کی قسم!" عمر کے معنی دین بھی ہوتے ہیں۔

کی بات کیا سُنتے ؟" اس کے بعد پھر داستان کا سلسلہ جاری رکھا اور کہا ۔

(۱۵/۷۳) فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُشۡرِقِيۡنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ﴿۷۴﴾

قصہ مختصر، ان لوگوں کو، سورج نکلتے ہی ایک ہولناک زلزلے نے آپکڑا اور آتش فشاں پہاڑ سے، ان پر مٹی کے پتھروں کی ایسی بارش ہوئی کہ ساری بستی تہ و بالا ہوگئی ۔

پھر مقطع کی آیت کے طور پر اس حقیقت کو دُہرادیا کہ یہ قصہ تو محض تاریخی واقعہ کے طور پر بیان کر دیا گیا ۔

(۱۵/۷۵) اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِيۡنَ ﴿۷۵﴾

یقیناً اس واقعہ میں ان لوگوں کے لیے عبرت کی بڑی نشانیاں ہیں جو فہم و فراست سے کام لے کر حقیقت تک پہنچنا چاہیں ۔

اور قوم مخاطب (عربوں) سے کہا کہ تمہیں اس قوم کے انجام کے متعلق بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیئے کہ :

(۱۵/۷۶) وَاِنَّهَا لَبِسَبِيۡلٍ مُّقِيۡمٍ ﴿۷۶﴾

(قوم لوطؑ کی بستی غیر معروف مقام پر نہیں تھی ۔) وہ اس راستے پر واقع تھی جہاں آمد و رفت کا سلسلہ اب تک قائم ہے (اس لیے یہ لوگ آتے جاتے اُس کے کھنڈرات دیکھ سکتے ہیں ۔)

اور زمانۂ نزولِ قرآن کے عربوں کے لیے ہی نہیں، قیامت تک قرآن پر ایمان لانے والوں کے لیے ۔

(۱۵/۷۷) اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۷۷﴾

یقیناً ان کھنڈرات میں ان لوگوں کے لیے حقیقت شناسی کی نشانیاں ہیں، جو خدا کے قانونِ مکافات پر یقین رکھتے ہیں ۔

——— (۰) ———

اس کے ساتھ (ضمناً) دو اور قوموں کے اس قسم کے انجام کا ضمنی تذکرہ کر دیا ۔ ایک قوم مدین جس کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے ۔ اسے اَصۡحٰبُ الۡاَيۡكَةِ بھی کہا گیا ہے ۔ یعنی گھنے جنگلوں میں رہنے

والی قوم اور دوسری اَصْحَابُ الْحِجْرِ یعنی قومِ ثمود جس کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے تھے۔ قومِ مدین کا تفصیلی تذکرہ، مطالبُ الفرقان جلد پنجم (صـ۳۰۹) میں آچکا ہے اور قومِ ثمود کا اُس جلد کے صـ۲۶۶ پر سورۂ ہود میں بھی اِن دونوں کا ذکر آیا ہے۔ (انڈکس دیکھئے)۔ یہاں کہا:

۱۵ (۷۸ — ۷۹) وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾

اور اسی طرح، اصحاب الایکہ (گھنے جنگلوں کے رہنے والے۔ یعنی قبیلۂ مدین کے لوگ) بھی بڑے سرکش تھے۔ سو ہم نے انہیں بھی، ان کی سرکشی کی سزا دی۔ اور یہ دونوں بستیاں (یعنی قومِ لوطؑ اور قومِ مدین کے شہر عام شاہراہ پر واقع ہیں۔

اور قومِ ثمود کے متعلق:

۱۵ (۸۰ — ۸۴) وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور اصحابُ الحِجر، یعنی قومِ ثمود نے بھی اپنے رسولوں کے پیغام کی تکذیب کی۔ انہیں ہم نے واضح قوانین دیئے تھے لیکن وہ ان سے رُوگرداں رہے (وہ بڑی طاقت ور قوم تھی) وہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر اپنے مکان بناتے تھے تاکہ (ان قلعہ نما گھروں میں) محفوظ رہیں۔ (۲۶/۱۴۹) لیکن ان کے یہ محفوظ قلعے بھی انہیں خدا کے عذاب سے نہ بچا سکے، صبح ہوتے ہی انہیں سخت ہولناک آواز کے ساتھ، عذاب نے آدبوچا۔ اور جو کچھ اُنہوں نے اپنی کوششوں سے اپنے لیے بنا رکھا تھا، وہ اُن کے کسی کام نہ آسکا۔

اقوامِ سابقہ کی یہ داستانیں اس لیے دُہرائی گئی ہیں کہ حضور نبی اکرمؐ اور جماعتِ صحابہؓ کو بتایا جائے کہ

حق و باطل کی وہ کشمکش جس کا سامنا وہ کر رہے ہیں، کوئی نئی بات نہیں، شروع سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آخر الامر کامیابی حق کی ہوتی ہے۔

یہ کشمکش اب آخری مراحل میں آ پہنچی تھی۔ اس لیے اس جماعتِ مومنین کو واضح طور پر بتا دیا کہ انقلاب کی گھڑی اب بالکل سر پر کھڑی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر ایک عظیم حقیقت بیان کی ہے اور وہ یہ کہ یہ سلسلۂ کائنات اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ اعمال کے ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب ہوں (۳/۴۵)۔ اس سلسلہ میں مطالبُ الفرقان جلد دوم (صفحہ ۹۳)، نیز (۵۳/۳۱ ؛ ۱۶/۳۹) دیکھئے۔

انقلاب کے لیے قرآنِ حکیم میں ساعۃ کا لفظ آیا ہے۔ (دیکھئے مطالبُ الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۲۷۲)، نیز سورۃ الاعراف۔ آیت (۷/۱۸۷)، مطالبُ الفرقان جلد ششم۔

اس کشمکش میں پروگرام یہ ہوتا تھا کہ خدا کا رسول اپنی مخاطب قوم تک خدا کا پیغام پہنچاتا تھا۔ ان میں سے جو سعادت مند افراد اس پیغام کو قبول کر لیتے وہ اس کی جماعت میں شامل ہو جاتے۔ آخر الامر ایسا مقام آجاتا جس میں نظر آجاتا کہ باقیماندہ افراد اس پیغام کو قبول نہیں کریں گے بلکہ اس کی مخالفت میں انتہا تک پہنچ جائیں گے۔ اس مقام پر رسول اپنی جماعت کے ساتھ وہاں سے ہجرت کر کے ایسے مقام کی طرف چلا جاتا جو اس کے مشن کے لیے زیادہ سازگار ہوتا۔ (انڈکس میں ہجرت کا عنوان دیکھئے)۔ یہ اس قوم سے قطعِ علائق کی علامت بھی ہوتی تھی۔ اس قطعِ علائق کی مثال یوں سمجھئے جیسے کوئی طبیب مریض کی بالیں سے یہ کہہ کر اُٹھ کر چلا جائے کہ : ؎

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی ہمیں توآس نہیں!

لیکن پیغمبرانہ اندازِ زیست یہ ہوتا تھا کہ کسی کے ساتھ رہنا تو ایک طرف، اس سے الگ ہونا پڑے تو بھی حُسن کارانہ انداز سے الگ ہُوا جائے۔ (۷۳/۱۰)

یہ تمام نکات اگلی ایک آیت میں سمٹا دیے گئے ہیں : فرمایا :

۱۵/۸۵—۸۶ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾

(اے رسول! تم نے دیکھ لیا کہ اقوامِ سابقہ کو اُن کے غلط اعمال نے کس طرح تباہ کر دیا. حقیقت یہ ہے کہ یہ سلسلۂ کائنات (ارض و سما) پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرتا ہے. تخریبی قوتیں، کائنات کے پروگرام میں فٹ نہیں بیٹھ سکتیں، اس لیے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں. لہٰذا، جو کچھ اُن اقوام کے ساتھ ہوا، وہی کچھ تمہاری مخاطب قوم کے ساتھ بھی ہوگا.) وہ فیصلہ کُن انقلاب جس سے انہیں متنبہ کیا جاتا ہے، آکر رہے گا. لہٰذا، تم ان سے اُلجھو نہیں. (جس قدر تبلیغ حق کا ضروری کام تھا، وہ ہو چکا) تم ان سے، نہایت خوش آیند طریق سے الگ ہو کر، اپنے پروگرام کی تکمیل میں مصروف رہو. (۲/۱۰۹) یہ سب کچھ تیرے اُس پروردگار کی طرف سے کہا جا رہا ہے جس نے اس تمام سلسلۂ کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کس قسم کی سعی و عمل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے!

قرآنِ حکیم نے تاریخ کو کس قدر اہمیت دی ہے، اس کے لیے انڈکس میں عنوان تاریخ دیکھئے. یہ جو کہا جاتا ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے" اِسے اگلی آیت میں بیان کر دیا. اس کی تشریح مطالبُ الفرقان جلد دوم ص۱۵۱ پر آ چکی ہے اس لیے یہاں اس کے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے.

(۱۵/۸۷) وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾

ہم نے تمہیں اس تاریخ کے متعدد واقعات کا علم دیا ہے، جو اپنے آپ کو دہراتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ قرآنِ عظیم عطا کیا ہے (جو ان اصولوں کو اپنے اندر رکھتا ہے جن کے مطابق اقوام کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں). (۲۴/۳۹)

کشمکش کے اس آخری مرحلہ میں، جب تصادم اپنی شدت کو پہنچ رہا تھا. جماعتِ مومنین کے دل میں یہ خیال اُبھرتا ہو گا کہ مخالفین مادی وسائل و ذرائع میں ان سے کہیں بڑھ کر ہیں اس لیے ان سے مقابلہ میں بڑی دقت پیش آئے گی. اس خیال کا ازالہ یہ کہہ کر کر دیا کہ تمہارے پاس جو (ایمان کی) قوت ہے اس کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکے گا. اس لیے تم (اپنی قلتِ اسباب کے خیال سے) گھبراؤ نہیں

اس کے ساتھ ہی سیرتِ رسولِ پاک کا ایک نہایت درخشندہ گوشہ بھی باعثِ فروغِ دیدہ بن رہا ہے. مخالفین کی جماعت تمام عمر مخالفت کرتی رہی اور اس میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا. حضورؐ تمام عمر ایک طبیبِ مُشفق کی طرح انہیں سمجھاتے رہے کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آ جائیں ورنہ تباہ ہو جائیں گے. حضورؐ کی یہ دردمندی اور غمگساری اس حد تک تھی کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا

مُؤۡمِنِیۡنَ (۲۶/۳)" ایسا نظر آرہا ہے کہ تو اس غم میں کہ یہ لوگ صحیح راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے، اپنی جان گھلا لیگا" یہاں کہا۔ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡهِمۡ (۱۵/۸۸)" تو ان کی تباہی کے تصوّر سے غم نہ کھا۔" کسی کی ہمدردی، خودکشی کرنے والے کی جان نہیں بچا سکتی اور اس کے بعد کہا کہ تم اپنی جماعت کی تنظیم و تربیت میں اور بھی شدت سے مصروف ہو جاؤ۔ یہ صحابہؓ کی جماعت تھی جن کے بلند و بالامقام اور حسنِ سیرت و کردار کے متعلق قرآن میں بڑی تفصیل سے آیا ہے (انڈکس میں عنوان صحابہؓ دیکھئے)۔ یہ تمام نکات ذیل کی آیت میں آگئے ہیں:-

۱۵/۸۸ لَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعۡنَا بِهِۦٓ أَزۡوَٰجًا مِّنۡهُمۡ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَٱخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِينَ ﴿٨٨﴾

(تاریخ کی ان سرگزشتوں اور قرآن کے ان بنیادی حقائق کے بعد) تم طبیعی زندگی کے اُس ساز و سامان کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے، ان میں سے مختلف طبقات کے لوگوں کو دے رکھا ہے۔ (اقوامِ سابقہ کو ان سے کہیں زیادہ ساز و سامانِ زیست حاصل تھا)۔ نہ ہی تم اپنے آپ کو اس غم میں گھلاتے رہو کہ یہ لوگ صحیح راستے کی طرف آکر، زندگی کی تباہیوں سے کیوں نہیں بچ جاتے! (نہ اقوامِ سابقہ نے اپنے پیغمبروں کی بات پر کان دھرا تھا، نہ یہ تمہاری بات سنیں گے)، تم اب (ان مخالفین کا خیال چھوڑ کر) ان لوگوں کو، جو اس پیغام کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں، اپنے بازوؤں کے نیچے سمیٹتے جاؤ (اور اس طرح مناسب تعلیم و تربیت سے، اپنی جماعتی تنظیم میں پختگی اور مرکزیت پیدا کرتے جاؤ۔ (۱۵/۹۴)

اور اس آخری مرحلہ میں بھی ان مخالفین کو ان کی غلط روش کے انجام سے آگاہ کرتے رہو۔

۱۵/۸۹ وَقُلۡ إِنِّيٓ أَنَا ٱلنَّذِيرُ ٱلۡمُبِينُ ﴿٨٩﴾

اور فریقِ مخالف سے کہتے رہو کہ میں تمہیں، تمہاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے کھلے طور پر آگاہ کر رہا ہوں۔

ان مخالفین میں وہ مخالف بھی ہیں جو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے رہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں (دیکھئے عنوان منافق)۔ ان لوگوں کی روش اور مسلک کو قرآن نے ایک لفظ "عِضِیۡنَ" میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ یہ بڑا جامع المعانی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں:-

۱۔ کسی چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ ان کا انداز یہ ہے کہ قرآن کی جو بات اپنے مفید مطلب ہو اُسے اختیار کر لیتے ہیں' جو اِن کے خلاف جائے اُسے چھپا دیتے ہیں۔ اس روش کا جو نتیجہ ہوتا ہے اُسے قرآن نے آیت (۲/۸۵) میں واضح کر دیا ہے۔ اس دُنیا میں ذِلّت اور خواری اور آخرت میں عذاب شدید۔

۲۔ اس کے معنی جھوٹ۔ فریب اور دھوکا کے بھی ہوتے ہیں۔

۳۔ نیز جنتر منتر، تعویذ، تاگے اور وظائف۔ جادو۔ ٹونے ٹوٹکے۔

قرآنِ کریم نے ان لوگوں کی جو روش بیان کی ہے، آپ غور کیجیے، کیا ہماری بعینہٖ یہی حالت نہیں ہے؟ کیا ہم نے بھی قرآن کا یہی مَصرف نہیں بنا رکھا۔

جن آیات کی یہ تشریح ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱۵ / ۹۰—۹۱) كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿٩١﴾

جن تباہیوں سے تو انہیں آگاہ کرتا ہے ان کا کچھ اندازہ ان لوگوں کو ہو بھی چکا ہے۔ یہ لوگ آپس میں قسمیں کھا کھا کر تیری مخالفت کرتے اور پھر جھوٹی قسموں سے تمہیں اپنی رفاقت کا یقین دلاتے تھے (۵/۵۳؛ ۹/۱۰۷؛ ۱۴/۴۴؛ ۱۶/۳۸؛ ۶۸/۱۰) اور اپنا سارا زور یہ مشہور کرنے میں صرف کر دیتے تھے کہ قرآن، جھوٹ، افترا، سحر اور کہانت کے سوا کچھ نہیں۔ سو ہم نے انھیں طرح طرح کے مصائب و نوازل میں مبتلا کیا (اور یہ تو ابھی ہلکے ہلکے جھٹکے تھے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا)۔

خُدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے اُن کی اس غلط روش کے نتائج نکھر کر ان کے سامنے آجائیں گے۔

(۱۵ / ۹۲—۹۳) فَوَرَبِّكَ لَنَسْــَٔـلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾

تیرے رب کا قانونِ مکافات اس پر شاہد ہے کہ ان سب سے، ان کے اعمال کی باز پرس ہو گی (اس قسم کی روش کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا)۔

ان کی مخالفت کا علاج یہ ہے کہ:

(۱۵ / ۹۴) فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾

لہٰذا، اے رسولؐ! تم ان کا خیال مت کرو، بلکہ (جیسا کہ تم سے کہا گیا ہے (۱۵/۹۴)) ان سے الگ ہٹ کر اپنی خدائی تنظیم کرو اور ان لوگوں سے اعراض برتو جو خدا کے ساتھ اور قوتوں کو بھی شریک کرتے ہیں۔

جس انداز سے نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین کو اطمینان دلایا جا رہا ہے، ان کی تسلی کرائی جا رہی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مرحلہ کس قدر جانگسل، ہمت شکن اور صبر آزما تھا۔

۱۵/۹۵—۹۶ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

یہ لوگ، جو خدا کے اقتدار کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرتے ہیں، تمہاری ہنسی اُڑا کر (بہت خوش ہوتے ہیں کہ بڑا کارنمایاں سرانجام دے رہے ہیں) ہم تیری طرف سے ان کے لیے کافی ہیں (ہمارا قانون مکافات ان سے نپٹ لے گا اور) انھیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ ان کے اس استہزاء کا انجام کیا ہے۔

یہاں استہزاء کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فولادی تیغ و سناں کے زخموں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن طنز و طعن کے گھاؤ ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔ بالخصوص اس لیے کہ طعن و تشنیع میں جس دنائت اور پستی کی سطح پر اُترنا پڑتا ہے، بلند سیرت و کردار کا حامل اس سطح پر اُتر نہیں سکتا۔ اور اپنے مقصد کی بلندی اور مشن کی پاکیزگی کا احساس ہی اس میں قوتِ برداشت پیدا کرتا ہے۔ اس لیے مُسْتَهْزِءِيْنَ کے مقابلے کے لیے اِنَّا كَفَيْنٰكَ کہا۔ اور فرمایا:

۱۵/۹۷ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾

ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں، اس کا تمہارے قلبِ حساس پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس سے تم کبیدہ خاطر ہو جاتے ہو۔

غور فرمائیے۔ کہا یہ ہے کہ حریف کی طعن آمیز باتوں (بِمَا يَقُوْلُوْنَ) سے جو کچھ تیرے دل پر گزر رہی ہے اس کا ہمیں پورا پورا علم ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مَا يَقُوْلُوْنَ کو برداشت کرنے کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دنیا میں بیشتر جھگڑوں اور فسادات کی بنیاد مَا يَقُوْلُوْنَ ہی ہوتی ہے۔ اگر باتوں کو برداشت کر لیا جائے تو جھگڑا بڑھتا ہی نہیں۔ یہ مقابلہ تو ٹینس کا کھیل ہوتا ہے۔ فریق مخالف جس شدت اور قوت سے گیند پھینکتا ہے اگر آپ اسے نرمی اور لطافت سے واپس کر دیں تو کھیل آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اگر ہم قرآن کی اتنی سی تلقین اور حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کے اتنے سے گوشہ پر عمل پیرا ہو جائیں تو کتنے جھگڑے اور فساد یونہی ختم ہو جائیں۔

لیکن حریف کے حملوں کو برداشت کرنا تو منفی عمل ہے، اس کے ساتھ مثبت پروگرام کی بھی ضرورت ہے اور وہ پروگرام یہ ہے کہ:

۱۵/۹۸ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾

(لیکن تم ان باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کرو۔ یہ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ تمہیں ان باتوں میں اُلجھا کر تمہاری توتوں کو منفیانہ طور پر ضائع کر دیں)، تم اپنے پروگرام کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہو تاکہ خدا کا نظامِ ربوبیت اس انداز سے متشکل ہو کر سامنے آجائے کہ وہ خدا کی حمد و ستائش کا زندہ پیکر بن جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت کرتے جاؤ۔ تم خود بھی ایسا کرو اور تمہاری جماعت بھی ایسا ہی کرے۔

لیکن یہ پروگرام وقتی اور ہنگامی نہیں، اسے آخری کامیابی تک مسلسل جاری رکھنا ہوگا۔

۱۵/۹۹ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

اور اس طرح اپنے نشوونما دینے والے کی محکومیت پورے طور پر اختیار کر لو تاآنکہ تمہارا یہ دعویٰ (کہ جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو، وہ نہایت خوشگوار نتائج کا حامل ہوگا اور غلط نظام پر چلنے والوں کا انجام تباہی و بربادی ہوگا) پایۂ ثبوت تک پہنچ جائے اور ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں دنیا کے سامنے آجائے۔

قرآن کی حامل اُمت کے لیے یہ پروگرام کسی خاص خطۂ زمین اور خاص زمانے تک محدود نہیں۔ اس کا منتہیٰ یہ ہے کہ:

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹)

تمام کرۂ ارض خدا کے نظامِ ربوبیت کے نور سے جگمگا اُٹھے۔

اور اس طرح جگمگا اُٹھے کہ پھر کوئی اس قندیلِ آسمانی کو بجھا نہ سکے۔ یہی اس کرۂ ارض پر انسانیت کی آخری منزل ہے۔ (۵۳/۴۲ ؛ ۴۴/۹)



اِشاریہ

ش

ص ۔ ض

ط ۔ ظ

ع ۔ غ

ف

ق

× × × × × ×